

مجلہ عدالتی نظائر



اردو زبان میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل
آئین و قانون کی دنیا کا پہلا مجلہ

مدیر اعلیٰ

سرپرست

مدثر اقبال

محمد ذوالقرنین

مشیر

مشیر

سلمان احمد مان

سجاد حمید یوسف زئی

شمارہ ۴، اپریل - جون ۲۰۲۳



برقی ویب گاہ: <https://courtingthelaw.com/>

"مجلہ عدالتی نظائر" آئین پاکستان اور اسلامی شریعت کی قائم کردہ مثالوں پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم اس مجلہ میں شائع ہونے والے تمام افکار اہل قلم شرکاء کی ذاتی رائے ہیں۔ اس مجلہ کا ان سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔
مجلہ عدالتی نظائر درج ذیل عدالتوں کے تمام موضوعات کے متعلق فیصلوں کے اردو میں ترجمے / تلخیص کا خیر مقدم کرتی ہے۔

- (1) عدالت عظمیٰ، پاکستان (Supreme Court of Pakistan)
- (2) وفاقی شرعی عدالت (Federal Shariat Court)
- (3) عدالت عالیہ اسلام آباد (Islamabad High Court)
- (4) عدالت عالیہ پشاور (Peshawar High Court)
- (5) عدالت عالیہ لاہور (Lahore High Court)
- (6) عدالت عالیہ بلوچستان (Baluchistan High Court)
- (7) عدالت عالیہ سندھ (Sindh High Court)
- (8) تمام ضلعی عدالتیں (All District Courts)
- (9) مرکزی عدالت گلگت بلتستان (Chief Court of GB)
- (10) مرکزی عدالت آزاد جموں و کشمیر (Chief Court of AJK)
- (11) خصوصی عدالتیں (Special Courts)
- (12) وفاقی اور صوبائی محتسب (Federal and Province Ombudsperson)
- (13) بین الاقوامی عدالت انصاف (International Court of Justice)

مجلہ حقوق محفوظ ہے۔ پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مجلہ کے کسی حصہ کی کسی بھی قسم کی اشاعت قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔

مجلہ عدالتی نظائر کے اگلے شمارے میں اپنی تلخیص شائع کرنے کے لئے اس میل پر اپنی تحقیق ارسال کرے۔

editor.majala@gmail.com

مجله عدالتی نظائر

اپریل-جون ۲۰۲۳

مجلس ادارات

سرپرست:	محمد ذوالقرنین، وکیل، عدالت عالیہ، پشاور و شریک بانی ٹیم آئین و قانون	مدیر اعلیٰ:	مدرس اقبال، طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مدیر:	محمد قمرالحق، صدر، جامعہ محمدی شریف، چینوٹ	شریک مدیر:	محمد اسد، وکیل و شریک بانی ٹیم آئین و قانون
نائب مدیر:	عاقب فاروق، طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور	شریک مدیر ۲:	رمضان اللہ، وکیل و شریک بانی ٹیم آئین و قانون
شریک مدیر ۳:	افراسیاب خان، وکیل و شریک بانی ٹیم آئین و قانون		

مجلس مشاورت

سجاد حمید یوسفزئی	سلمان احمدان
وکیل، عدالت عالیہ، اسلام آباد و شریک بانی ٹیم آئین و قانون	وکیل، عدالت عالیہ، لاہور و شریک بانی قانون دان

فہرست

شمار	عنوان	تلفیض نگار	صفحہ
	تلفیض نگاران		104
	اداریہ		106
	تقریظ	ڈاکٹر قبلہ ایاز	107
<u>دیوانی فیصلے</u>			
1	نیب ٹرامیم کیس کی براہ راست نشریات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	109
2	ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے مریض کو نقصان پہنچنے پہ ہر جانہ کس طرح لیا جائے؟ اس قضیے پہ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس چوہدری محمد اقبال صاحب کا بہت ہی اہم فیصلہ	مدثر اقبال	112
3	امریکہ میں ایک دلچسپ ٹارٹ کیس کا خلاصہ	سجاد حمید یوسفزئی	115
4	دیوانی مقدمات کی سماعت کے دائرہ کار؛ یعنی سول جج کس مالیت کی حد تک کمیونز کی سماعت کا حق رکھتے ہیں، کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	اسامہ محمد خان	119
5	غیر قانونی بے دخلی ایکٹ ۲۰۰۵ میں بریت کے خلاف اپیل کا حق ہے یا نہیں، لاہور ہائیکورٹ کے معزز جج، جسٹس جناب امجد رفیق صاحب کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ	طاہر خان وزیر	123
6	ہائی کورٹ یا اپیلٹ کورٹ کا اپیل کے فیصلے میں ماتحت عدالتوں کے ججز کے کردار اور قابلیت کی بنا پر انکے خلاف ہدایات اور ریبارکس پاس کرنے کے بارے میں سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ	کعب بن مصور	125

- 7 وفاق و صوبے کے درمیان کسی معاملے [مثلاً اعلیٰ تعلیم] پر حق قانون سازی کے حوالے سے تنازعہ کے بابت سپریم کورٹ کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ
- 129 حمزہ خان
- 8 مشہور زمانہ کیس، مسماۃ شہلا خنیاء بنام واپڈا، کا خلاصہ
- 135 ریاض احمد بٹ
- 9 شفعہ کے کیس میں اضافی ٹیکس یعنی فیس مقررہ مدت میں جمع نہ کرنے کی بناء پر شفعہ کے مقدمہ کی اخراج کے حوالے سے عدالت عالیہ پشاور کا اہم فیصلہ
- 140 امین قاسم
- 10 سپریم کورٹ کا غیر ملکی ثالثی ایوارڈز سے متعلق ایک اہم فیصلہ
- 144 فیصل شہزاد غفاری

فوجداری مقدمات

- 11 سٹیچوٹری گراؤنڈ پر ضمانت کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم اور تاریخ ساز فیصلہ
- 148 محمد ذوالقرنین
- 12 قادیانی شہری کو سپریم کورٹ کی جانب سے ضمانت دینے کے معاملہ پر سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ
- 151 محمد ذوالقرنین
- 13 ملزم کو پولیس ریمانڈ میں بھیجنے سے متعلق لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ
- 154 افراسیاب خان
- 14 پولیس کا ایک سے زائد کیسز میں ملزم کو بار بار جسمانی ریمانڈ پر حراست میں لینے کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ
- 159 حمزہ خان
- 15 ایف آئی آر کے اندراج کے حوالے سے جسٹس آف پیس اور پولیس کے اختیارات/ حدود و قیود اور جھوٹے مقدمات کی روک تھام کا صحیح راستہ کیا ہے، سپریم کورٹ کے معزز جج، جناب جسٹس محمد علی مظہر صاحب کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ
- 162 طاہر خان وزیر
- 16 دماغی طور پر عدم توازن کے شکار شخص پر گستاخی رسول کے الزام کی صورت میں ضمانت سے متعلق سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ
- 165 میاں محمد قاسم

- 178 168 محمد مخدوم شاہ ایک سے زائد مقدمات میں نامزد ملزم کو، کورٹ کی جانب سے کسی بھی ایک مقدمے میں ضمانت ملنے کے بعد، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے سابقہ مقدمات میں گرفتار کر سکنے/نہ کر سکنے کے اختیارات سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ
- 172 172 حمزہ خان سچے کے ساتھ ریپ کے کیس میں سچے کی واحد گواہی پر ملزم کو سزا سنانے کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ
- 176 19 عدالت عظمیٰ کا تفتیشی افسر کی جانب سے تفتیش میں بے ایمانی کرنے پر ملازمت سے برطرف کرنے کے حوالے سے انتہائی اہم فیصلہ
- 179 20 شازیہ نصیر وارثی طبعی کوتاہی پر ہونے والی ایف آئی آر کی قانونی حیثیت سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ
- 182 21 اعجاز احمد غنی قتل کے مقدمے میں قصاص اور تعزیر کی سزاؤں کے نفاذ کا تعین کے حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ
- 185 22 محمد مخدوم شاہ عدالت سے ضمانت شدہ ملزم کو، اسی مقدمے میں نئے جرائم کے اضافے کی صورت میں گرفتار کرنے/نہ کرنے کے اختیارات کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ
- 188 23 فرقان احمد کیا فوجداری مقدمات مختار نامے کے ذریعے سے چلائے جا سکتے ہیں؟ اس قضیے پر اسلام آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ
- 190 24 محمد ذوالقرنین ملزم کے حق ضمانت کو ضمانتی چٹکوں کے علاوہ دیگر شرائط کے ساتھ مشروط کرنے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ

عائلی مقدمات

- 25 جمع بین الاختین یعنی دو سگی بہنوں کو ایک ہی ساتھ نکاح میں رکھنے کے
کیس میں ملزم کی ضمانت کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک اہم
فیصلہ
- 26 عائلی عدالتوں کی جانب سے تنسیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کو تنسیخ نکاح
بزریہ خلع میں تبدیل کرنے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک نہایت
ہی اہم فیصلہ
- 27 مدعیہ کا دوہری شہریت کے حامل ہونے کی وجہ سے خلع کی درخواست
کی صورت میں پاکستان کی مقامی عائلی عدالتوں کے اختیار سماعت کے
حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 28 ہبہ یعنی گفٹ کے ذریعے خواتین کو وراثتی جائیداد سے محروم کرنے کے
حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 29 حق حضانت یعنی کسٹڈی آف مائٹر کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کے جج، جسٹس اطہر
من اللہ صاحب کا ایک انتہائی اہم فیصلہ
- 30 شادی کے لئے کم سے کم عمر کے تعین میں جنس کی بنیاد پر تفریق کے
حوالے سے عدالت عالیہ لاہور کا ایک اہم فیصلہ
- 31 لاہور ہائی کورٹ کا عبوری کسٹڈی [حضانت] کے حوالے سے ایپیل
کورٹ کے دائرہ اختیار پر اہم فیصلہ
- 194 محمد ذوالقرنین
- 197 محمد ذوالقرنین
- 201 زاہد الرحمن
- 205 منوہلا ارباب
- 207 محمد ذوالقرنین
- 211 عاقب فاروق
- 213 عروج شہباز

تلخیص نگاران

محمد ذوالقرنین

ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، و شریک ہائی آئین و قانون

سجاد حمید یوسفزئی

ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، و شریک ہائی آئین و قانون

مدثر اقبال

مدیر اعلیٰ مجلہ عدالتی نظائر

اسامہ محمد خان

وکیل، پشاور بار ایسوسی ایشن

طاہر خان وزیر

رکن آئین و قانون

کعب بن مصور

طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

حمزہ خان

وکیل، ضلع تیرگرہ دیر لور

ریاض احمد بٹ

طالب علم شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، رکن آئین و قانون

ایمن قاسم

طالبہ، شعبہ شریعہ و قانون، اسلامیہ کالج پشاور

فیصل شہزاد غفاری

وکیل، رکن آئین و قانون

افراسیاب خان

وکیل، رکن آئین و قانون

میاء محمد قاسم

طالب علم، شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد مخدوم شاہ

طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، رکن آئین و قانون

شازیہ نصیر وارثیہ

طالبہ، شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد بلال

طالب علم، شعبہ شریعہ و قانون، اسلامیہ کالج پشاور، رکن آئین و قانون

اعزاز احمد غنی

وکیل، رکن آئین و قانون

فرقان احمد

طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد و ممبر ٹیم آئین و قانون

زاہد الرحمن

طالب علم، شعبہ شریعہ و قانون، اسلامیہ کالج پشاور

منویلا ارباب

طالبہ، شعبہ، اسلامیہ کالج پشاور و ممبر ٹیم آئین و قانون

عاقب فاروق

طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، رکن آئین و قانون

عروج شہباز

طالبہ، شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، رکن آئین و قانون

اداریہ

ایک وکیل کی بنیادی خصوصیت سچائی کی تلاش کے ساتھ ساتھ ثبوت کی فراہمی ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وسیع اور عمیق مطالعے کے بغیر سچائی کی تلاش اور ثبوت کا حصول ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں اور اس بات میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ مطالعہ کے بغیر کسی بھی شعبہ میں اوج کمال تک پہنچانا ممکن ہے جبکہ شعبہ قانون اور بالخصوص وکالت میں مطالعے کی ضرورت باقی تمام شعبہ ہائے زندگی سے کہیں زیادہ ہے اور مطالعے میں بھی بالخصوص عدالتی نظائر کا مطالعہ شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے لئے بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدالتی نظائر کی اسی اہمیت کے پیش نظر القرضی لائسنس ایٹس، آئین و قانون اور قانون دان نے جولائی ۲۰۲۳ سے پاکستان کی آئینی و قانونی تاریخ میں پہلی مرتبہ سہ ماہی بنیاد پر سلیس اور آسان اردو میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل مجلہ عدالتی نظائر کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔ یاد رہے کہ مجلہ عدالتی نظائر اس طویل المدت سوچ کی پہلی سیڑھی ہے جس میں بالخصوص شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے احباب اور بالعموم عام عوام کی تمام ضروریات پر مشتمل قومی زبان اردو میں ایک مجلہ ہو۔ امید واثق ہے کہ مجلہ عدالتی نظائر کا علمی و ادبی معیار بہت جلد ملک پاکستان کے ممتاز مجلوں میں شمار ہوگا۔

مدیرِ اعلیٰ

مجلہ عدالتی نظائر

تقریظ

قانون پر عملدرآمد اور اس کی بالادستی کے لیے اولین اور اہم ترین ذیہ اس کی عام فہم زبان، مطالب، تعبیرات و اصطلاحات ہوتی ہیں؛ تاکہ اس نظام قانون کے حقیقی شرکاء (سٹیک ہولڈرز) یعنی عوام پر یہ بات واضح ہو کہ یہ قانون اور نظام ان پر کیا ذمہ داریاں عائد کرتا ہے اور ان کے حقوق کی پاس داری کیونکر کرتا ہے۔ اگر کسی بھی ملک کا نظام قانون اس ملک کی مقامی زبان میں نہ ہو یعنی ان کی سمجھ سے بالاتر ہو تو ایسی صورت میں ریاست اور شہریوں کے مابین ہم آہنگی اور اعتماد کی فضاء کا قیام خاصا مشکل ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ ریاست جس قانون کے ذریعہ شہریوں سے تعامل کرتی ہے وہ زبان کی وجہ سے شہریوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قانون کے میدان میں تحقیق و تجزیے کی روایت شروع ہوئی ہے اور ان شاء اللہ اس میدان میں نئے تجربات ہوں گے اور پاکستان بھی ایک دن ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ شانہ بہ شانہ ہوگا۔

ہمارے قانونی نظام پر عوام کا اعتماد تب تک بحال نہیں ہو سکتا جب تک ہم قانون کو عام فہم اور سلیس انداز میں اور عوامی رابطے کی زبان میں پیش نہ کریں۔ اس ضمن میں اہم ترین قدم عدالتی فیصلہ جات کی عام فہم انداز میں ترجمہ و تفسیر کا ہونا ہے؛ تاکہ وکلاء اور طلباء قانون کے ساتھ ساتھ عوام بھی ملکی قانون، اس کی تشریح و تعبیر اور قانون کے ارتقاء کو سمجھ سکیں اور اصول قانون و فقہ و آئینی تعبیرات کے مباحث میں براہ راست حصہ لے سکیں کہ بالآخر ان سب کے شرکاء (سٹیک ہولڈرز) عوام بھی تو ہیں، بلکہ عوام ہی تو ہیں۔

پاکستان کے نظام عدل و قانون میں اصلاح کے لئے ناگزیر ہے کہ آئین پاکستان سمیت تمام قوانین بھی عوامی رابطے کی زبان میں مقامی فہم اور سماجی اقدار سے ہم آہنگ اصول قانون کے مطابق مرتب کیے جائیں۔ چونکہ یہ بات واضح ہے کہ اس ملک کی قومی زبان اردو ہے اور اردو ہی وہ قابل فہم و ادراک زبان ہے کہ جس پر پوری قوم متفق ہو سکتی ہے۔ لہذا قانون سمیت عدالتی نظائر کا اردو زبان میں لکھنا یا ترجمہ کرنا ہی اس کا بہترین حل ہے۔ اس جانب

عدالتی سطح پر سب سے پہلا قدم جسٹس (ر) جو ادیس خواجہ صاحب نے اٹھایا تھا؛ لیکن ان کی سبک دوشی کے بعد تو جیسے اس حوالے سے ایک طویل خاموشی آگئی۔ اس سکوت کو قانون کے ماہرین اور طلباء کی ٹیم، "ٹیم عدالتی نظائر" نے عدالتی نظائر کی اردو میں تلخیص کو آن لائن مجلہ، مجلہ عدالتی نظائر، کی صورت میں شائع کر کے توڑا ہے۔ اس جفاکش ٹیم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ قابل صد ستائش و تحسین ہے اور یقیناً یہ پاکستانی قوم پر ایک احسان ہے۔ امید ہے کہ اس علمی کام میں مزید بہتری آئے گی اور اس طرح عوام اور عدالتوں کے درمیان اعتماد کی بہتر فضا قائم ہوگی۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

رکن، شریعت ایسیٹ بیچ، عدالت عظمیٰ، پاکستان
وسابق صدر نشین اسلامی نظریاتی کونسل

دیوانی مقدمات

نیب ترامیم کیس کی براہ راست نشریات کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ¹

محمد ذوالقرنین²



کیس کے حقائق:

ایڈووکیٹ جنرل خیبر پختونخوا کی جانب سے سپریم کورٹ میں زیر سماعت نیب ترامیم کیس میں ایک متفرق درخواست اس بابت جمع کرائی گئی کہ اس کیس یعنی نیب ترامیم کیس کو باقی کیسز کی طرح براہ راست نشر کیا جائے۔ یاد رہے کہ مندرجہ بالا درخواست دائر کرنے کی واحد وجہ یہ بتائی گئی کہ سپریم کورٹ کی جانب سے صرف اس ایک کیس کو براہ راست نہ دکھانا امتیازی سلوک کے زمرے میں آتا ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل خیبر پختونخوا کی جانب سے دائر کی جانے والی اس درخواست کو سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بینچ کے سامنے سماعت کے لئے مقرر کیا گیا جن میں چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب، جسٹس امین الدین خان صاحب، جسٹس جمال خان مندوخیل صاحب، جسٹس اطہر من اللہ صاحب اور جسٹس سید حسن اطہر رضوی صاحب شامل تھے۔

فیصلے کا آغاز:

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کی ابتداء اس بات سے کی ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل خیبر پختونخوا کی مندرجہ بالا درخواست درحقیقت مکمل طور پر حقائق کے منافی ہے کیونکہ سپریم کورٹ نے بہت ہی کم کیسز کی براہ راست سماعت نشر کی ہے اور کچھ کیسز تو ایسے بھی ہیں کہ جن کو ابتدائی طور پر براہ راست نشر کیا گیا لیکن عدل و انصاف کے وسیع تر مفاد

¹ یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے لکھا ہے جن کے ساتھ جسٹس امین الدین خان، جسٹس جمال خان مندوخیل اور جسٹس سید حسن اطہر رضوی نے اتفاق کیا ہے جبکہ جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے اختلاف کیا ہے اور فیصلہ کو اکثر اکورٹ اپیل نمبر ۴، ۳، ۲، ۱ سال ۲۰۲۳ کے طور پر پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

² ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، ممبر ٹیم قانون دان و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

میں ان کی براہ راست نشریات کو بعد میں روک دیا گیا۔ اس کے بعد سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں باقاعدہ صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل خیبر پختونخوا نے اپنی درخواست میں کسی بھی عدالتی نظیر پر نہ تو انحصار کیا ہے اور نہ ہی سہارا لیا ہے۔ مندرجہ بالا نکات زیر غور لانے کے بعد عدالت نے ایک اور اہم نکتہ یہ ذکر کیا ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل خیبر پختونخوا کو کم سے کم یہ تو پتہ ہونا چاہیے کہ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۰۰ میں کبھی تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں اور قانونی تحفظ کے مساوی طور پر ہقدار ہیں لیکن اس درخواست میں کہیں پر بھی اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ حکومت خیبر پختونخوا کو کیسے قانون کی نظر میں برابر ہونے یا مساوی تحفظ کے حق سے محروم کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں پر عدالت نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس درخواست کو مسترد کرنے کے لئے یہ ایک وجہ بھی کافی ہے لیکن ہم اس کو مسترد کرنے کی بجائے میرٹ پر فیصلہ دیں گے۔

سپریم کورٹ نے مندرجہ بالا مختصر تمہید کے بعد میرٹ پر فیصلے کی ابتداء سپریم کورٹ کی براہ راست نشریات کی تاریخ سے کی ہے اور اس بات یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ سپریم کورٹ نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۸ ستمبر ۲۰۲۳ کو براہ راست نشر کیا جس کے بعد مختلف اوقات میں وقتاً فوقتاً چالیس کے قریب مقدمات کو براہ راست نشر کیا گیا۔ سپریم کورٹ کی جانب سے براہ راست نشریات کا فیصلہ کثیر المقاصد تھا جس میں تعلیمی، شفافیت، یکطرفہ اور غلط رپورٹنگ کی روک تھام وغیرہ شامل تھے لیکن ان تمام مقاصد کے باوجود براہ راست نشریات میں ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اس سہولت کا غلط استعمال مذموم مقاصد کی خاطر ہو سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس عدالت کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے کہ اس سہولت کا غلط استعمال نہ ہو۔

براہ راست نشریات پر ایک مفصل بحث کے بعد عدالت موجودہ کیس کی طرف واپس آئی ہے اور لکھا ہے کہ عمران احمد نیازی نے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۸۴ [۳] کے تحت نیب ٹراہیم کو چیلنج کیا تھا جس میں ان کی نمائندگی وکلاء کی کثیر تعداد نے کی جن میں خواجہ حارث صاحب نمایاں رہے۔ یہاں پر سپریم کورٹ نے انتہائی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مندرجہ بالا ذکر شدہ مرکزی کیس میں ۵۳ پیشیوں میں عمران نیازی کسی ایک بھی موقع پر عدالت میں پیش نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی جانب سے اور نہ ہی حکومت خیبر پختونخوا کی جانب سے اس کیس کی براہ راست نشریات کی درخواست پیش کی۔ یاد رہے کہ ۱۵ ستمبر کو عمران نیازی کی جانب سے دائر ہونے والے اس کیس کا فیصلہ آنے کے بعد اس فیصلے کے خلاف دواثر اکورٹ اپیلیں ہوئی جس میں عمران نیازی نے درخواست کی کہ وہ خود پیش ہوں گے جس پر ان کی درخواست منظور ہوئی اور ان کو ویڈیو لنک پر باقاعدہ لیا گیا لیکن ۳۰ مئی کو عمران نیازی نے درخواست کی کہ وہ خواجہ حارث کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کی اس درخواست کو بھی

قبول کیا گیا اور اس عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ عمران نیازی جب بھی ترمیم کیس کے متعلق خواجہ حارث سے مشورہ کرنا چاہیں تو ان کو اور دو اور وکیلوں کو بھی ملنے دیا جائے اور چونکہ عمران نیازی کو اب نمائندگی مل چکی ہے لیکن اس کے باوجود عمران نیازی کی ویڈیولنک کی سہولت کو اس عدالت نے ختم نہیں کیا۔ نیز حکومت خیبر پختونخوا کو نہ صرف مرکزی کیس میں عمران نیازی نے فریق نہیں بنایا اور نہ ہی حکومت خیبر پختونخوا نے ایسی کوئی درخواست کی ہے اور چونکہ حکومت خیبر پختونخوا مرکزی کیس میں پارٹی نہیں تھی تو اس وجہ سے اس کو ان ایپیلوں میں بھی پارٹی نہیں بنایا جاسکتا۔

عدالت کا فیصلہ:

عوام کی جانب سے بھی ترمیم میں کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی بلکہ شاید سرے سے دلچسپی ظاہر ہی نہیں کی گئی لیکن بہر حال جب بھی کسی بھی سیاسی جماعت کے سربراہ یہ چاہیں کہ ان کو سنا جائے اور وہ سپریم کورٹ کے وکیل بھی نہ ہوں تو یہ خطرہ بہر حال برقرار رہتا ہے کہ اس براہ راست نشریات کو سیاسی مقاصد اور پوائنٹ سکورنگ کے لئے استعمال کیا جائے تو عدالت کی نظر میں یہ ہی وہ سب سے زیادہ قابل توجہ یا قابل غور بات تھی جس کی وجہ سے اس درخواست کو مسترد کیا گیا اور عدالت کے اس شک کو تقویت اس وقت ملی جب عمران نیازی کو ۳۰ ستمبر کو سنا گیا کیونکہ انھوں نے اس کیس سے ہٹ کر مختلف ایسے کیسز کا ذکر کیا جس سے سرے سے ان ایپیلوں کا کچھ بھی لینا دینا نہیں تھا۔ اس لئے ایڈوکیٹ جنرل خیبر پختونخوا کی یہ درخواست ناقابل سماعت ہونے کے ساتھ ساتھ میرٹ پر بھی قابل اخراج ہے اور اس کے ایڈوکیٹ جنرل خیبر پختونخوا اس عدالت کو اس بابت بھی مطمئن نہیں کر پائے کہ آخر ایسی کیا ضرورت پڑی کہ انھوں نے براہ راست نشریات کی درخواست دی کیونکہ مرکزی کیس میں انھوں نے کبھی بھی حصہ نہیں لیا۔

یاد رہے کہ عدالت نے اپنے فیصلے کے آخر میں یہ بات واضح کی ہے کہ براہ راست نشریات کے لئے نہ صرف درخواست دی جاسکتی ہے بلکہ اس پر اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے جس کو قبول یا خارج کرنا سپریم کورٹ کی صوابدید پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے مریض کو نقصان پہنچنے پہ ہر جانہ کس طرح لیا جائے؟ اس قضیے پہ عدالت عالیہ،

لاہور کے جسٹس چوہدری محمد اقبال صاحب کا بہت ہی اہم فیصلہ³

مدثر اقبال⁴



یہ مقدمہ لاہور ہائی کورٹ کے سامنے دیوانی عدالت، فیصل آباد کے فیصلے خلاف بطور اپیل پیش آیا۔

مقدمے کے حقائق:

فریاد کنندہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں سال ۲۰۱۲ میں پانچویں سمسٹر کی طالبہ تھی۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ کو اسے اپنے بازو میں درد محسوس ہوا جس پر وہ چیک اپ کے لیے الائنڈ ہسپتال، فیصل آباد چلی گئی۔ میڈیکل چیک اپ کے بعد اس کو سر جری تجویز کی گئی اور ۱۷ ستمبر کو اس کا آپریشن کیا گیا۔ ۱۸ ستمبر کو اس نے شکایت کی کہ اس کے بدن کا نچھلا حصہ کام نہیں کر رہا۔ اس کے والد نے اس کو دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے انتہائی غفلت سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے اس کے سر بیڑھ کی ہڈیاں اور ”سپائنل کارڈ“ کٹا ہوا ہے۔ اس غفلت پر اس کے والد نے پنجاب ہیلتھ کیئر کمیشن کے سامنے شکایت درج کی۔ جس کی تفتیش پر ڈاکٹر کو زمدار ٹھہرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے خلاف اپیل اور بعد میں رٹ پٹیشن بھی دائر جو کہ دونوں مسترد کر دیے گئے۔ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ نے بھی انکوائری کی اور اس کی پینشن ختم کرنے کا فیصلہ جاری کیا۔

اپیل کنندہ / مدعیہ نے ۷ کروڑ روپے کے ہر جانہ ادا کرنے کا دعویٰ دائر کیا، جس پر سول کورٹ نے ہر جانہ کے رقم کو ۱۵۰ لاکھ تک کرنے کا فیصلہ جاری کیا۔ اس فیصلے کے خلاف دونوں مدعیہ اور مدعا علیہ نے اپیل دائر کی۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا مدعیہ واقعی ۷ کروڑ روپے بطور ہر جانہ کی حقدار ہے؟

³ اس کیس کو ریگلو فرسٹ اپیل نمبر ۲۰۱۳-۷ آف ۲۰۲۳ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁴ ٹیم ممبر آئین و قانون۔

• یہ حقائق ثابت کرنے کا بار ثبوت مدعیہ پر لادا گیا۔

عدالت کے سامنے مدعیہ بذات خود پیش ہوئی۔ جس پر اس نے اپنا بیان پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شہزاد انور جو کہ مدعیہ کے چچا نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد مدعیہ کے ماں کا بیان بھی ریکارڈ کیا گیا۔ مدعا علیہ کی طرف سے مدعا علیہ خود اور ڈاکٹر ارشد علی چیمہ [میڈیکل سپرنٹنڈنٹ الائیڈ ہسپتال] نے اپنے اپنے بیان ریکارڈ کروائے۔

عدالت نے سب سے پہلے پنجاب ہیلتھ کیئر کمیشن ایکٹ ۲۰۱۰ میں "میڈیکل نیگیجنس" کے تعارف پر غور کیا۔ اس کے بعد ایکسپٹ ڈاکٹر زکے بورڈ کی میڈیکل رپورٹ بھی دیکھی اور ساتھ میں مدعا علیہ / ڈاکٹر کے بیان کو بھی دیکھا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ اس ڈاکٹر کے پاس یہ آپریشن کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی اور اس نے آپریشن کے دوران غفلت سے کام لیا ہے۔

اس کے بعد عدالت آئین میں موجود بنیادی حقوق کے طرف آتی ہے اور ساتھ ایک کیس [زابدہ افضل کیس] کا بھی ذکر کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ لاء آف نارٹ کے فعالیت آج کے دور کی ضرورت ہے، تاکہ لوگ سمجھے کہ ایک قوم قانون میں مذکور ذمہ داریوں کو پورا کیے بغیر کبھی بھی آگے نہیں جاسکتی، ساتھ میں اس بات پر زور دیا کہ قانون کے اچھے اثرات تب تک نہیں آتے جب تک اس کو سختی سے نافذ العمل نہ کیا جائے۔ ساتھ میں سورۃ البقرہ کا بھی حوالہ دیا۔ اس کے علاوہ طلحی غفلت پر [متعدد عدالتی نظائر]⁵ کا بھی ذکر کیا۔

عدالت اس بات کی طرف بھی آتی ہے کہ مدعا علیہ کا یہ موقف تھا کہ یہ کیس سرے سے نہیں بنتا کیونکہ جو شکایت اس نے کی تھی چارہ جوئی [ریبیڈی] پہلے سے ہی اس نے لے رکھی ہے، اس پر عدالت نے پنجاب ہیلتھ کیئر کمیشن ایکٹ ۲۰۱۰ پر غور کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کمیشن کو صرف ہیلتھ سروس پرواڈر یعنی ہسپتال وغیرہ کے بدانتظامی اور غفلت اور ان پر الزامات کے تفتیش کے اختیار ہے ہر جانہ طے کرنے کا اختیار اس کمیشن کے پاس نہیں ہے یہ صرف سول کورٹ کے پاس اختیار ہے۔

⁵ Punjab Road Transport Corporation Vs Zahida Afzal & Others (2006 SCMR 207)

⁶ 1996 CLC 1440, 1969 AIR SC 128, 2000 AIR SC 1888, 2019 SCMR 143, 2016 SCMR 663, 2011 SCMR 1836.

عدالت نے آخر میں یہ کیا کہ میڈیکل برانڈ نامی کے کیس کو "لاء اف ٹارٹ" کے تحت ڈیل کیا جائے، اور پاکستان اس میں انگلش لاء کی پیروی کرتا ہے۔

عدالت نے کہا کہ ہر جانہ کی رقم کا تعین کرنے کے لیے عدالت کو اپنے سامنے یہ بنیادی اصول رکھنے ہے۔

1. نقصان کے وجہ سے معقول اور منصفانہ مالی معاوضہ
2. تکلیف اور درد کے وجہ سے مالی معاوضہ
3. سہولتوں کے ختم ہونے کے وجہ سے نقصان کے تلافی کے لئے معاوضہ
4. طبی اخراجات
5. پیسے کمانے سے محروم ہونے کا نقصان، اس رقم کا اندازہ کرنے کے لیے کم سے کم 2 سال کا وقت پر غور کرنا پڑے گا۔
6. مالی نقصان: سفر کے اخراجات، سپیشل کیئر کا خرچہ، وغیرہ
7. درد اور تکلیف کے وجہ سے نقصان جیسے کے زلت آمیز رویے، جسم میں بگاڑ، عمر متوقع میں کمی وغیرہ۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت نے کہا کہ ڈاکٹر کے غفلت کی وجہ سے مدعیہ کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے جس کو پیسوں سے پورا نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس رقم کی وجہ سے کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے۔ عدالت نے ٹرائل کورٹ کے ۵۰ لاکھ ہر جانہ کی رقم کو بڑھا کر ایک کروڑ تک کرنے کا فیصلہ جاری کر دیا۔

امریکہ میں ایک دلچسپ ٹارٹ 7 کیس کا خلاصہ⁸

سجاد حمید یوسفزئی⁹



کیس کے حقائق:

بورل ایک امریکن شہری تھا جس نے مختلف کمپنیوں کے ساتھ کئی عشروں تک کام کیا۔ وہ کمپنیاں پیپر بناتی تھی اس میں ایک زہریلے مادے کا استعمال ہوتا تھا جس کا نام ہے ”ہیڈسیسٹوس“¹⁰۔ اس مادے کی وجہ سے کئی ساری بیماریاں پھیل سکتی تھی۔ بورل کو آخر میں جاکر کینسر ہوا اور وجہ دریافت ہوئی کہ ”ہیڈسیسٹوس“ نے اس کو کینسر زدہ کر دیا تھا۔ اس نے دعویٰ فائل کیا۔ اس دوران وہ فوت ہوا مگر اس کی بیوی کو بطور دعویٰ دار کیس میں شامل کر دیا۔ ٹرائل کورٹ نے بورل کے حق میں فیصلہ دیا اور کمپنیوں کو تقریباً ۸۰ ہزار سے اوپر ہرجانہ بورل کو ادا کرنے کا کہا۔ کمپنیوں نے یہی فیصلہ چیلنج کیا۔

عدالت میں استدلال:

⁷ ٹارٹ وہ قانون ہے جس کے تحت کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص، کمپنی یا ریاستی ادارے کے خلاف اس کے غفلت پر مبنی رویہ کی بنیاد پہ ہرجانہ مانگ سکتا ہے۔

⁸ Borel vs. Fidebroad Paper Products Corp. 493 F.2d 1076 (5th Cir. 1973).

⁹ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

¹⁰ ہیڈسیسٹوس ایک گرمی اور آگ کے خلاف مزاحمت کرنے والا معدنیات ہے جو عام طور پر فرش، چھت اور آٹوموٹو پارٹس جیسے تعمیراتی مواد میں استعمال ہوتا تھا۔

اپیلٹ کورٹ کے سامنے بہت دلچسپ دلائل پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ٹارٹ سے متعلق بہت سے تصورات پہ بحث ہوئی ہے۔ بہت ساری اصطلاحات بھی زیر بحث آئی ہیں۔ آگے انہیں پہ روشنی ڈالتے ہیں۔

کمپنیوں نے کہا کہ ان پہ ”سٹرکٹ لائیبلٹی“¹¹ لاگو نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ہر پروڈکٹ میں کچھ نہ کچھ ضرر ضرور ہوتا ہے۔ عدالت نے اس پہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ”پراڈکٹ لائیبلٹی“ کا مطلب یہ نہیں کہ بنانے والا ہر قسم کے ضرر کا ذمہ دار ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی پروڈکٹ تب مضر یا نقص والا سمجھا جائے گا جب وہ نامناسب طور پر خطرناک ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پروڈکٹ کا ضرر اس کے فائدے سے زیادہ ہو۔

عدالت نے یہاں ایک اور نکتے کی طرف بھی رخ کیا ہے وہ یہ کہ ٹھیک ہے کوئی کمپنی ہو سکتا ہے اپنی پروڈکشن کو ہر طریقے سے محفوظ بنا لے مگر صرف یہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کمپنی نے صارف کو اپنی پروڈکٹس کے سائڈ ایفیکٹس سے باقاعدہ آگاہ بھی کرنا ہے۔ اگر کمپنی یہ آگاہی نہیں دیتی تو یہ بھی غفلت سمجھی جائی گی اور کسی بھی نقصان کی صورت میں کمپنی ”سٹرکٹ لائیبلٹی“ کے تحت ذمہ دار سمجھی جائے گی۔ [مثلاً سگریٹ کی ڈبی پہ جس طرح کی وارننگ ہوتی ہے۔ وہ ضروری ہے]۔

عدالت سے اس کیس میں کمپنیوں نے ٹرائل میں جائے بغیر ”سمری ججمنٹ“¹² دینے کا بھی کہا تھا۔ سمری ججمنٹ کے کچھ اصول بھی عدالت نے بتا دیے ہیں۔ یہ کہ سمری ججمنٹ کی اجازت تب دی جائے جب تمام تر حقائق کی بنیاد پہ عدالت ایک ایسی نتیجے پہ پہنچے کہ کوئی بھی معقول شخص کسی بھی صورت کسی دوسرے نتیجے پہ نہیں پہنچ سکتے گا، اگر اس کے برعکس کوئی

¹¹ A strict liability tort is a type of personal injury case in which you as the defendant are held liable regardless of whether you were negligent or not.

¹² یہ ایک ایسا فیصلہ ہوتا ہے جس میں شہادت ریکارڈ نہیں ہوتی بلکہ دستیاب ریکارڈ کے تحت عدالت فیصلہ دیتی ہے۔

بھی شواہد موجود ہوں یا کوئی شک ہو تو اس کا فائدہ اس فریق کو ہوگا جو سہری ججمنٹ کی مخالفت کر رہا ہے۔

عدالت نے پھر اگلے نکتے کی طرف رخ کیا ہے وہ یہ کہ کیا جس خطرے کی بات بول کر رہا تھا وہ اس وقت متوقع تھا یعنی اس کی پیش بینی ممکن تھی۔ کیوں کہ جو خطرہ پہلے سے نہ بھانپا جا سکتا ہو اس پہ کسی کمپنی کو موردِ اِزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ عدالت نے دیکھا کہ ”ہیسیس میٹس“ کا خطرہ ۱۹۳۰ میں ہی متوقع بن گیا تھا مگر اس کے باوجود کمپنیوں اس طرف توجہ نہیں دی اور اپنے ورکرز کو خردار نہیں کیا۔ یہی غفلت ہے۔

اگلا مرحلہ عدالت کے سامنے یہ تھا کہ بولر نے تو مختلف کمپنیوں میں کام کیا ہے جو کہ ”ہیسیس میٹس“ کا استعمال کرتی تھی۔ اب یہ کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بولر کو کونسی کمپنی کے ”ہیسیس میٹس“ سے کینسر ہوا ہے۔ چون کہ یہ معلوم کرنا ممکن نہیں لہذا کمپنیوں کو بری ذمہ قرا دیا جائے۔ یہ کمپنیوں کی دلیل تھی۔ اس پہ عدالت نے ایک اہم اصول کی نشان دہی کی وہ یہ کہ جب بہت سے لوگوں کے غفلت پر مبنی فعل سے کسی کو نقصان ہو اور وہ فعل علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو کہ کس شخص نے کتنا نقصان پہنچایا ہے تو ایسے میں سارے غافل اشخاص ایک ساتھ اور علیحدہ علیحدہ ذمہ درا ہوں گے اور سبھی سے ایک ہی طرح سے ہرجانہ وصول کیا جائے گا۔

کیس یہاں پہ ختم نہیں ہوتا بلکہ عدالت کے سامنے ایک اور چیلنج ایک قاعدہ¹³ کا تھا یعنی کمپنیوں نے یہ کہا بولر کو معلوم تھا کہ ”ہیسیس میٹس“ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے مگر اس کے باوجود اس نے کام جاری رکھا یہ اس کی اجازت اور رضا مندی کے مترادف ہے کہ بھلے ”ہیسیس میٹس“ اسے نقصان پہنچائے وہ کام جاری رکھے گا۔ یہ اصول دراصل ایک دفاعی ہتھیار ہے جو نارٹ کرنے والے شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

عدالت نے اس پہ کہا کہ بلکل یہ اصول ہے مگر اس کیس میں یہ اصول بولر پہ نافذ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اسے یہ علم تو تھا کہ ”ہیسیس میٹس“ نقصان دہ مادہ ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا

¹³ Volanti non fit injuria

کہ وہ جان لیوا ہے اور زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا اور تب وہ کام جاری رکھتا تو تب کمپنیاں یہ دفاعی ہتھیار لے سکتی تھی کہ معلوم ہونے کے باوجود کام جاری رکھنا بورل کی رضا مندی کے مترادف ہے۔ اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے کمپنیاں نہیں۔

اسی طرح عدالت نے کہا کہ ”معاوی غفلت“¹⁴ اور رضامندی والے اصول میں بہت بڑا مگر باریک فرق ہے۔ ماقبل الذکر کا مطلب ہے کہ بورل نے اپنا خیال نہیں رکھا اور وہ اپنی صحت کے حوالے سے غفلت برتا رہا۔ اس صورت میں بورل کی غفلت کمپنیوں کے لیے دفاع نہیں ہو سکتا جس کی آڑ میں وہ چھپ سکے۔ ایسا وہ تب کر سکتی ہیں جب بورل کی رضامندی ظاہر ہو۔ ”معاوی غفلت“ مدعا علیہ کے لیے دفاع نہیں بنتا۔ اگر بورل کو کمپنیوں کی طرف سے وارننگز دی جاتی کہ ”ہینسیسٹوس“ خطرناک مادہ ہے اور وہ ان وارننگز پہ کان نہ دھرتا تو بورل غفلت کا مرتکب ہوتا مگر کمپنیوں نے ایسی کوئی وارننگ نہیں دی ہے۔

اس کیس میں بہت ہی پر مغز گفتگو ہوئی ہے۔ عدالت نے ہر ہر نکتے پہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ ٹارٹ کا تصور سمجھنے کے لیے یہ اہم ترین کیسز میں شمار ہوتا ہے۔

¹⁴ contributory negligence

دیوانی مقدمات کی سماعت کے دائرہ کار؛ یعنی سول جج کس مالیت کی حد تک کیسز کی سماعت کا حق رکھتے ہیں، کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ¹⁵

اسامہ محمد خان¹⁶



کیس کے حقائق:

زیر نظر رٹ پٹیشن کے دونوں فریقین کے درمیان دو من میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج ایبٹ آباد کے منافع/آمدن کے متعلق سول جج ایبٹ آباد کی عدالت میں کیس شروع ہوا، مدعی علیہ نے جواب دعویٰ سمیت کیس خارج کرنے کی استدعا کی لیکن یہ استدعا کی درخواست خارج کر دی گئی۔ عدالت نے دعویٰ جات کے بنیاد پر ایشوز فریم کئے اور فریقین سے ان پر دلائل طلب کئے۔ مدعی نے اپنے گواہ پیش کئے اور ساتھ میں فاضل عدالت سے ریسیور مقرر کرنے کی استدعا کی کیونکہ معاملہ پیسوں کا تھا اور مدعی کو اپنے حقوق کا تحفظ مقصود تھا اور اس درخواست پر بھی مدعی علیہ نے مکمل مقابلہ کیا اور اس درخواست کا جواب جمع کر دیا۔ مدعی کے ریسیور مقرر کرنے والے درخواست پر جو دن فیصلہ کے لئے مقرر تھا اس دن فاضل عدالت کو لگا کہ چونکہ مدعی نے رقوم کی منتقلی/سپردگی کا دعویٰ کیا ہے اور متنازعہ اکاؤنٹس کا حجم میری اختیار سے متجاوز ہے لہذا معزز سول جج صاحب نے ۳۱ جولائی ۲۰۲۳ کو یہ دعویٰ فاضل ڈسٹرکٹ جج کے پاس بھیج دیا اس درخواست سمیت کہ جس عدالت کو اس دعویٰ کو سننے کا اختیار ہو وہاں اس دعویٰ کو مقرر کیا جائے۔

¹⁵ یہ اہم فیصلہ پشاور ہائی کورٹ ایبٹ آباد جج کے جج جناب جسٹس محمد اعجاز خان صاحب نے لکھا اور سنایا ہے۔ اس فیصلے کو پشاور ہائی کورٹ کے ویب سائٹ پر رٹ پیشینہ نمبر-اے آف ۲۰۲۳ یا ۲۰۲۳ کے نی ایل جے ۷۷۲ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

¹⁶ ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن۔

اسی روز ڈسٹرکٹ جج صاحب نے اس دعویٰ کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے سامنے سماعت کے لئے مقرر کیا۔

مدعی نے سول جج کے ۳۱ اگست ۲۰۲۳ کے حکم، جس کے ذریعے دعویٰ کو ڈسٹرکٹ جج کے پاس بھیج دیا، کو نگرانی اپیل کے ذریعے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں چیلنج کر دیا جبکہ دوسری طرف مدعی علیہ نے ڈسٹرکٹ جج کے ۳۱ اگست ۲۰۲۳ کے فیصلہ، جس کے ذریعے ڈسٹرکٹ جج نے دعویٰ کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے پاس لگا دیا تھا، پر نظر ثانی کی درخواست دے دی لیکن ان ہر دو درخواستوں کو ایک علیحدہ فیصلے کے ذریعے خارج کر دیا۔

اب اس علیحدہ تنازعہ فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں الگ الگ اپیلیں دائر کی گئیں جن کو معزز عدالت عالیہ نے یکجا کر کے سننے کا فیصلہ کیا۔

بنیادی سوالات:

مندرجہ بالا قضیہ کو حل کرنے کے مقصد سے عدالت عالیہ نے اپنے سامنے ایک سوال مکمل وضاحت کے ساتھ جبکہ دیگر سوالات بین السطور رکھے:

1. پہلا سوال جو بالکل وضاحت کے ساتھ رکھا گیا وہ یہ کہ کیا اس مقدمے کو سننے کا اختیار سول جج کے پاس ہے یا ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے پاس جبکہ اس قضیہ کی کل مالیت ۵ کروڑ سے متجاوز ہے۔

2. دوسرا اہم سوال جس کا جواب بین السطور دیا گیا وہ یہ کہ جب ایک قضیہ خاص اور عام دونوں قوانین کا عنوان ہوتا ہے تو فوقیت کس قانون کو دی جائیگی اور کیا یہ فوقیت مشروط ہوگی یا غیر مشروط؟

3. تیسرا سوال جو بین السطور رکھا گیا وہ یہ تھا کہ کورٹ فیس وغیرہ جیسے مقاصد کے لئے اگر دعویٰ کی قیمت کا تخمینہ مدعی نے لگایا ہو تو کیا وہی تخمینہ حرف آخر ہوگا یا متعلقہ عدالت کو اس میں ردوبدل کا اختیار ہے؟

اس قضیہ کی حقائق کی طرف بڑھنے سے پہلے اس کی قانونی حیثیت کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے دو شق یعنی شق نمبر ۶ اور ۹۶ اس کیس سے متعلق ہیں۔

اول الذکر میں سول جج اور ڈسٹرکٹ جج کے مالی معاملات میں اختیار سماعت کے لئے مقرر کردہ نصاب کی بات کی گئی ہے جبکہ آخر الذکر یعنی شق ۹۶ میں ان ہر دو عدالتوں کے احکامات/فیصلہ جات کے خلاف اپیل کے لئے موزوں فورم کی بات کی گئی ہے۔

سال ۲۰۱۹-۲۰۲۰ سے پہلے مغربی پاکستان سول کورٹس آرڈیننس ۱۹۶۲ کے شق ۹ کے تحت عدالت عالیہ کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے سول جج کے اختیارات کا تعین کرے لیکن سال ۲۰۲۰ میں خیبر پختونخواہ میں ضابطہ دیوانی میں قانون سازی کے ذریعے ترمیم کی گئی ہیں اور ان ترمیم میں ضابطہ دیوانی کا شق ۶ بھی شامل ہے جس میں سول جج بشمول ڈسٹرکٹ جج کے مالی معاملات میں اختیار سماعت کے نصاب کو مقرر اور مختص کیا گیا۔ ۲۰۲۰ کے ترمیم کے بعد ضابطہ دیوانی کے شق ۶ کہتا ہے کہ اگر کسی قضیہ کی کل مالیت ۵ کروڑ سے کم ہو تو سول جج کو اس قضیہ کو سننے اور فیصلہ دینے کا اختیار ہے جبکہ ڈسٹرکٹ جج کو وہ قضیہ سننے اور اس میں فیصلہ دینے کا اختیار ہے جس قضیہ کی کل مالیت پانچ کروڑ یا اس سے زیادہ ہو۔

اب آتے ہیں ضابطہ دیوانی کے شق ۹۶ کی طرف اس میں بھی سال ۲۰۲۰ میں ترمیم کی گئی ہے۔ ترمیم کے بعد ضابطہ دیوانی کی شق ۹۶ میں درج ہے کہ اگر کسی قضیہ میں سول جج کوئی حکم/فیصلہ سنا دے تو اسکی اپیل ڈسٹرکٹ جج کو کی جائے گی جبکہ ڈسٹرکٹ جج کے کسی حکم/فیصلہ کے خلاف اپیل ہائی کورٹ میں کی جائیگی۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ ضابطہ دیوانی کے شق ۹۶ میں ترمیم سے پہلے اپیل کا متعلقہ قانون ۱۹۶۲ کے آرڈیننس کا شق ۱۸ تھا۔

ضابطہ دیوانی کے ان ۲ شقوں کو اکٹھا پڑھنے کے بعد ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر کسی قضیہ کی کل مالیت ۵ کروڑ سے کم ہو تو سول جج کو اسکو سننے کا اختیار ہے اور اس سول جج کے حکم/فیصلہ کے خلاف اپیل ڈسٹرکٹ کورٹ میں کی جائیگی جبکہ دوسری طرف اگر کسی قضیہ کی کل مالیت ۵ کروڑ یا اس سے زائد ہو تو اس کا اختیار سماعت ڈسٹرکٹ جج کے پاس ہوگا اور ڈسٹرکٹ جج کے حکم/فیصلہ کے خلاف اپیل ہائی کورٹ میں کی جائیگی۔

ان نئی ترمیم نے بڑی وضاحت کے ساتھ سول جج کی اختیار سماعت کی زیادہ سے زیادہ مالی نصاب کی بات کی اور اسی طرح ڈسٹرکٹ جج کے اختیار سماعت کے کم از کم مالی نصاب کی بات بھی کی

لیکن ڈسٹرکٹ جج کے اختیار سماعت کے زیادہ سے زیادہ مالی نصاب کی بات نہیں کی لہذا ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ڈسٹرکٹ جج کے مالی معاملات میں اختیار سماعت لامحدود ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور اہم سوال سامنے آیا کہ مدعی نے کورٹ [فیس اور سوٹ ویلوشن ایکٹ ۱۸۸۷] کو مد نظر رکھ کر دعویٰ کی قیمت کا تخمینہ ۲ کروڑ لگایا ہے۔ اب اگر مدعی کے اس تخمینہ کو لیا جائے تو پھر سول جج صاحب کو یہ قضیہ سننے کا اختیار ہے لیکن یہاں پر یہ عدالت کا اختیار ہے کہ اگر وہ سمجھتی ہے کہ مدعی نے تخمینہ درست نہیں لگایا ہے یعنی کمی بیشی کی ہے تو عدالت جو تخمینہ لگائے گی وہ معتبر ہوگی اور اسی کی بنیاد پر اختیار سماعت کا فیصلہ ہوگا یعنی کہ کس عدالت کو اس قضیہ کا اختیار سماعت حاصل ہے اور مدعی کے لگائے گئے تخمینہ کو کوئی وقعت حاصل نہ ہے۔

دوران دلائل مدعی کے وکیل نے عدالت کے سامنے یہ گزارش رکھ دی کہ ۱۹۶۲ کا آرڈیننس خاص قانون ہے جبکہ ضابطہ دیوانی عام اور خاص قانون کو عام پر فوقیت حاصل ہوتی ہے لیکن اسی اس دلیل کو اس بنیاد پر رد کر دیا گیا کہ خاص قانون کو عام پر فوقیت تب حاصل ہوگی جب دونوں قوانین میں کوئی کھلا تضاد ہو جبکہ یہاں پر ۱۹۶۲ کے آرڈیننس اور ۲۰۲۰ کے ضابطہ دیوانی کے ترامیم میں کوئی تضاد نہیں لہذا کوئی فوقیت حاصل نہ ہے۔

خلاصہ :

چونکہ اس مقدمے کی کل مالیت ۵ کروڑ سے زائد تھی لہذا ضابطہ دیوانی میں نئے ترامیم کے مطابق اس قضیہ کا اختیار سماعت ڈسٹرکٹ جج کو حاصل ہے لیکن چونکہ دونوں فریقین نے سول جج کے سامنے اپنا کیس شروع کیا تھا اور کسی حد تک چلایا تھا تو جس جگہ پر سول جج صاحب نے کیس روک دیا تھا ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج صاحب کیس کو اس جگہ سے ہی آگے بڑھائے اور جہاں تک خاص و عام قانون کی بات ہے تو یہاں پر دونوں میں کوئی تضاد نہیں لہذا یہاں خاص قانون کو کوئی فوقیت حاصل نہیں اور اگر کورٹ فیس اور اختیار سماعت کے مقاصد کے لئے مدعی نے کسی دعویٰ کی قیمت کا تخمینہ لگایا لیکن عدالت نے یہ سمجھ لیا کہ یہ غیر مناسب ہے یعنی اصل قیمت سے کم یا زیادہ ہے تو جو تخمینہ ٹرائل عدالت نے لگایا وہی قابل عمل ہوگا اور مدعی کے تخمینہ کو کوئی اعتبار حاصل نہ ہے۔

غیر قانونی بے دخلی ایکٹ ۲۰۰۵ میں بریت کے خلاف اپیل کا حق ہے یا نہیں، لاہور ہائیکورٹ کے معزز جج، جسٹس جناب امجد رفیق صاحب کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ¹⁷

طاہر خان وزیر¹⁸



کیس کے حقائق:

درخواست گزار نے مذکورہ ایکٹ کے تحت درخواست دائر عدالت کی جس میں ناکامی ہوئی اور ملزم کو عدالت نے بری کر دیا۔ درخواست گزار (اپیل کنندہ) نے ملزم کی بریت کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ معزز ہائی کورٹ نے سوال اٹھایا کہ درخواست گزار کو مذکورہ قانون کے دفعہ ۸[۱] کے تحت بریت کے خلاف اپیل کا حق کس بنیاد پر حاصل ہے؟

دفعہ ۸ یہ کہتا ہے کہ دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ ۲ اور ذیلی دفعہ ۳ اور دفعہ ۸ کے ذیلی دفعہ ۱ کے تحت کوئی بھی صادر شدہ حکم، حکم کے تین دن کے اندر، قابل اپیل ہوگا۔ مذکورہ دفعات کی دو شقیں مختلف سزاؤں کا ذکر کرتی ہے، جبکہ ایک شق زمین کے مالک یا قابض کو قبضہ دلانے کے بابت ہے۔

پس مذکورہ بالا دفعات میں سزاؤں اور قبضہ واپسی کے خلاف اپیل کا ذکر ہے، کمپینٹ [استغاثہ] کا اخراج کہیں بھی صریحاً ذکر شدہ نہیں ہے۔ [مؤخر الذکر امر ہائی کورٹ کے اس سوال اور اس پر زیر بحث فیصلے کا سبب بنا]۔ اپیل کنندہ نے پشاور ہائی کورٹ کے فرائض دیہ بنام سید محمد وغیرہ پر انحصار کرتے ہوئے دلیل پیش کی کہ دفعہ ۸[۱] میں لفظ "کوئی حکم"¹⁹ کا استعمال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حکم چاہے سزا کا ہو، قبضہ واپسی کا ہو یا بریت کا، متاثرہ فریق کو اپیل کا حق ہوگا۔

بنیادی سوال:

¹⁷ اس فیصلے کو "شاء اللہ خان بنام سرکار" اور "۲۰۲۲ پی۔ سی آر۔ ایل جے ۱۸۲۸ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

¹⁸ وکیل و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

¹⁹ Any order

غیر قانونی بے دخلی ایکٹ کے تحت بریت کے خلاف اپیل کا حق موجود ہے کہ نہیں؟ کیا اپیل کا حق کتنا تباہ یا جاسکتا ہے؟

عدالت کا فیصلہ:

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ یہ دلیل درست نہیں ہے کیونکہ دفعہ ۸ [۱] نے اپیل کا حق ایکٹ کی تمام دفعات [جیسے ۴، ۶ اور ۷] کے تحت حکم کے خلاف ہر گز نہیں دیا ہے۔ بلکہ یہ حق مخصوص احکامات [زیر دفعہ ۳ ذیلی ۱ اور ۳ اور دفعہ ۸ ذیلی دفعہ ۱] کے خلاف دیا ہے۔

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ ماسوائے دفعہ ۳ اور ۸ کے دیگر دفعات کے تحت صادر کئے گئے احکامات کے خلاف متقنہ نے اپیل کا حق سرے سے دینے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ اپیل ایک قانونی حق ہے جس کا وجود تشریح سے نہیں بلکہ صریحاً قانون کے متن سے واضح ہے۔ یہی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۰۴ بھی درج ہے۔ یعنی صریحاً تو اپیل کا حق دفعہ ۳ ذیلی دفعہ ۱ اور ۲ اور ۳ (سزائیں) اور دفعہ ۸ [۱] (مالک یا قابض کو قبضہ واپسی کا طریقہ کار) کے تحت صادر کئے گئے احکامات کے خلاف ہی ہے، اس لیے دفعہ آٹھ - اے میں موجود لفظ "کوئی" کے معنی ہر گز بریت کے حکم کے خلاف حق اپیل کے نہیں ہو سکتے۔

مندرجہ بالا وجوہات اور دلائل کی بنیاد پر معزز عدالت نے قرار دیا کہ غیر قانونی بے دخلی ایکٹ ۲۰۰۵ میں بریت کے حکم کے خلاف حق اپیل موجود نہ ہے۔ یوں اپیل کنندہ کی اپیل خارج کر دی گئی۔

ہائی کورٹ یا ایپیلٹ کورٹ کا ایپیل کے فیصلے میں ماتحت عدالتوں کے ججز کے کردار اور
قابلیت کی بنا پر انکے خلاف ہدایات اور ریہارکس پاس کرنے کے بارے میں سپریم
کورٹ کا اہم فیصلہ²⁰

کعب بن مصور²¹



کیس کے مختصر حقائق:

صوبہ پنجاب کی ضلعی عدالت شیخوپورہ کے دو سول جج صاحبان ، حسین رضا اور نازیہ علی ، ضابطہ دیوانی کے دفعہ ۱۲ [۲] کے تحت کی گئی درخواست اور دعویٰ برائے تعیللِ منحصر کے مقدموں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ان فیصلوں کے خلاف لاہور ہائیکورٹ میں اپیلیں دائر کر دی جاتی ہے۔ لاہور ہائیکورٹ ۲۶ جون ۲۰۲۱ کو ایپیلوں کا فیصلہ سناتی ہے اور ہمراہ دیگر چیزوں کے ، فیصلے کے پیراگراف نمبر ۲۳ میں دونوں سول جج صاحبان کے کردار اور انکی جانب سے کی گئی عدالتی کارروائی کو مشکوک ، قرار دے کر اس معاملے کو چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے سامنے پیش کرنے کی ہدایات دیتی ہے تاکہ ان سول جج صاحبان کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔ لاہور ہائیکورٹ کے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرتے ہوئے دونوں سول جج صاحبان پٹیشن دائر کر دیتے ہیں۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال :

²⁰ یہ فیصلہ جسٹس سید منصور علی شاہ نے لکھا اور باقی دو ججز نے انکے ساتھ اتفاق کیا۔ اس کیس کو "سی پی نمبر ۱۸۶۲-۱۱ ایل آف ۲۰۲۱" کے حوالے سے سپریم کورٹ کی ویب سائٹ پر پڑھا جاسکتا ہے۔

²¹ ایل ایل بی شریعہ اینڈ لاء، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔

کیا کوئی بھی ہائی کورٹ یا ایپلٹ کورٹ کسی بھی ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف کی گئی اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے، ماتحت عدالت کے جج کے کردار اور قابلیت کی بنیاد پر، اسکے خلاف کوئی ہدایات، پابندیاں یا ریمارکس پاس کر سکتی ہے یا نہیں؟

وکلاء کے دلائل :

پیشترز کے وکیل نے سپریم کورٹ میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ²²، سپریم کورٹ کے اسی نوعیت کے کیس، نصرت یاسمین بنام رجسٹرار، پی ایچ سی، میں دیے گئے پہلے فیصلے اور اُس سے اخذ شدہ اور واضح کردہ اصولوں کے خلاف ہے، جن کی پیروی کرنا ہائیکورٹس کیلئے لازمی ہے۔

اس فیصلے میں قرار دیا گیا ہے کہ کوئی بھی ہائی کورٹ یا ایپلٹ کورٹ، کسی بھی ماتحت عدالت کے جج کے فیصلے کے خلاف اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے، جج کے کردار یا قابلیت کی بنا پر، اسکے خلاف پابندیاں، ہدایات اور ریمارکس پاس نہیں کر سکتی۔

تاہم اگر ایپلٹ کورٹ یہ سمجھتی ہے کہ اس جج کی عدالتی کارروائی اور اسکے دیے گئے فیصلوں میں انتہائی سنجیدہ بے ضابطگی پائی جاتی ہے تو وہ اسکے فیصلے کے خلاف اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے، ایک خفیہ نوٹ کے ذریعے سے، اس جج کے خلاف کھلی عدالتی کارروائی کے بجائے انتظامی کارروائی کا حکم دے سکتی ہے۔ اسی جواب کو ایک اور کیس [عجاز احمد بنام ریاست²³] میں بھی سپریم کورٹ نے اختیار کیا ہے۔ لہذا مذکورہ دونوں جج صاحبان کے خلاف لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے میں دیے گئے ریمارکس اور ہدایات کو حذف کیا جائے۔

لاہور ہائیکورٹ کی جانب سے سپریم کورٹ میں کوئی بھی پیش نہیں ہوا لہذا ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔

عدالت کا استدلال :

²² PLD 2019 SC 719

²³ PLD 2021 SC 752

سپریم کورٹ نے جج صاحبان کے فیصلے کے خلاف کی گئی اپیل کے حقائق کو زیر سماعت مقدمے سے لا تعلق قرار دیتے ہوئے ان کا فیصلے میں ذکر نہیں کیا اور پٹیشنرز کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے درج ذیل موقف اختیار کیا۔

سپریم کورٹ کا تین رکنی بنچ مذکورہ بالا سوال کا جواب نصرت یاسمین کیس میں آئین و قانون کی متعلقہ شقوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دے چکا ہے اور اسی جواب کو اعجاز احمد کیس میں بھی اختیار کیا گیا ہے جس پر انحصار کرتے ہوئے پٹیشنرز نے پٹیشن دائر کی ہے۔

عدالت نے کہا کہ دوبارہ اس سوال کا جواب دینا غیر ضروری ہے، تاہم نصرت یاسمین کیس میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، جو اصول اخذ اور واضح کیے گئے ہیں انہیں دوبارہ ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ اپیلٹ کورٹس اور ہائیکورٹس ان اصولوں کی سختی سے پابندی کریں۔

وہ اصول یہ ہیں کہ کوئی بھی اپیلٹ کورٹ؛

1. کسی ماتحت عدالت کے جج کے فیصلے کے خلاف اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے، جج کی قابلیت اور کردار کی بنیاد پر، اسکے خلاف پابندیاں، ہدایات اور ریمارکس پاس نہیں کر سکتی۔

2. جج کو عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی دینے کا نہیں کہہ سکتی کہ اس نے چیلنج کیا گیا فیصلہ کیوں اور کیسے دیا۔

3. اگر وہ جج کے دیے گئے فیصلے میں ایسی بے ضابطگی اور عدالتی کارروائی کی غلطیاں دیکھتی ہے جو دوسرے کیسز میں دہرائی نہیں جانی چاہیں تو ایک خفیہ نوٹ کے ذریعے سے متعلقہ جج کے علم میں لائے۔

4. اگر وہ ٹھوس وجوہات کی بنا پر یہ سمجھتی ہے کہ جج نے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں شدید نالائقی کا مظاہرہ کیا ہے یا ایسی واضح غلطی کی ہے جس کی بنا پر اسکے خلاف ایکشن لیا جانا چاہیے تو وہ اسکے لیے متعلقہ ادارے یا ادارے کے مقرر کردہ افسر کو خفیہ رپورٹ کی ذریعے اطلاع کرے گی کہ وہ اپیل کورٹ کے فیصلے سے لا تعلق ہو کر اپنی ضابطے کی کارروائی مکمل کرے۔

یہاں عدالت نے ایک اہم اصول بیان کرتے ہوئے کہا کہ عدالتی نظام ججز کے غلطی کرنے کے امکان کو تسلیم کرتا ہے اور اسی لیے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق بھی دیتا ہے۔ لیکن ایپلٹ کورٹ کو چاہیے کہ اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے جج کے کردار اور قابلیت کے بجائے صرف قانونی پہلو کو مد نظر رکھے اور زیر بحث لائے۔

تاہم اگر وہ سمجھتی ہے کہ جج واقعی واضح غلطی کر رہا ہے تو اس کے خلاف نصرت یاسمین کیس کے فیصلے میں دیے گئے طریق کار کے مطابق انتظامی کاروائی کرے۔

یہاں پر سپریم کورٹ نے عدالتی فیصلوں کی پابندی کے حوالے سے²⁴ عمودی نظائر²⁵ افقی نظائر تقسیم کرتے ہوئے بتایا کہ افقی نظائر، جو کہ اعلیٰ عدالتوں یعنی سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے فیصلے ہیں، کی آئین کے آرٹیکل ۱۸۹ اور ۲۰۱ کے مطابق تمام ماتحت عدالتوں پر پابندی لازمی ہے جبکہ عمودی نظائر، جو کہ ایک ہی عدالت، جیسا کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ، یا اسکی ہم منصب عدالت کے فیصلے ہیں، کی پیروی اسی عدالت پر لازمی ہے۔ تاہم وہ عدالت ٹھوس وجوہات کی بنا پر لارج بچ بنا کر اپنا فیصلہ تبدیل کر سکتی ہے۔

مزید براں سپریم کورٹ یہ بھی قرار دیتی ہے کہ اعلیٰ عدالتی فیصلوں کی پابندی، ملکی عدالتوں کے فیصلوں میں یکسانیت کو یقینی بناتی ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر سپریم کورٹ کے فیصلوں کی پابندی پورے ملک کی عدالتوں پر لازمی ہے۔ ایسا نہ کرنا عدالتوں کی جانب سے ڈھٹائی، آئین کی خلاف ورزی اور عوام میں اعلیٰ عدالتوں کے وقار میں کمی کا باعث ہے۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت دونوں پیشینہز کو ایپیلوں میں بدل کر منظور کرتی ہے، اور لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے میں مذکورہ ریہارکس اور ہدایات کو حذف کرنے کا حکم دیتی ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی قرار دیتی ہے

²⁴ Horizontal precedents.

²⁵ Vertical precedents.

کہ اگر لاہور ہائیکورٹ کے معزز جج صاحب ضروری اور مناسب سمجھتے ہیں تو موجودہ فیصلے میں دہرائے گئے اصولوں کے مطابق ججز کے خلاف انتظامی کارروائی کا حکم دے سکتے ہیں۔

وفاق و صوبے کے درمیان کسی معاملے [مثلاً اعلیٰ تعلیم] پر حق قانون سازی کے

حوالے سے تنازعہ کے بابت سپریم کورٹ کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ²⁶

27 حمزہ خان



کیس کے حقائق:

درخواست گزار نمبر ۳۳۱۱ ہائیر ایجوکیشن کے ساتھ منسلک تھے، اور وائس چانسلر کی پوسٹ پر تعینات ہونے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے ہائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ پنجاب کے نوٹیفیکیشن مورخہ ۳ مارچ ۲۰۱۵ اور ۷ اپریل ۲۰۱۵ کو ہائی کورٹ کے سنگل جج کے سامنے چیلنج کیا۔ پہلا نوٹیفیکیشن دو سال کے لئے سرچ کمیٹی تشکیل دیتا ہے جو وائس چانسلر کی پوسٹ کے لئے تین مناسب اشخاص کے نام تجویز کرے گی۔ دوسرا نوٹیفیکیشن وائس چانسلر کی پوسٹ کے لئے درکار شرائط مثلاً قابلیت، تجربہ، وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔

عدالت کے سامنے اہم ترین سوالات:

1. کیا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معیارات کے تعین کا اختیار، زیر اثری ۱۲ حصہ دوم فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ، صرف وفاق کو حاصل ہے؟ یا تعلیم "ریزیڈوری" یعنی

²⁶ یہ فیصلہ جسٹس منصور علی شاہ کا تحریر کردہ ہے جس کو [پی ایل ڈی ۲۰۱۷ لاہور صفحہ ۳۸۹] حوالے

کے ذریعے دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

²⁷ وکیل، ڈسٹرکٹ کورٹس تیسرے دیر لوئیر و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

بقایا لسٹ کا حصہ ہونے کی بناء پر صوبوں کے دائرہ اختیار میں آتا ہے؟ کیا تعلیم کے معنی میں اعلیٰ تعلیم بھی شامل ہے؟ کیا تعلیم کے معاملہ میں قانون سازی کے اختیارات وفاق اور صوبوں دونوں کو حاصل ہیں؟ کیا فیڈرلزم اور اس کی شاخیں مثلاً کوآپریٹو فیڈرلزم اس مسئلے کا حل فراہم کرتی ہیں؟

2. کیا ایچ ای سی آرڈیننس، ۲۰۰۲ میں درج اعلیٰ تعلیمی اداروں کے متعلق معیارات بنیادی اور ہدایتی ہیں یا لازمی؟ کیا مذکورہ ۱۳ [۲] اور [۴] یونیورسٹی آف پنجاب ایکٹ، ۱۹۷۳ء خلاف آئین و قانون ہیں؟ کونسل آف کانسٹنٹس کا فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے حصہ دوم میں درج معاملات کے حوالے سے کیا کردار ہے؟ کیا کونسل نے یہاں اپنا آئینی کردار ادا کیا ہے؟

پہلا سوال:

درخواست گزار نمبر ۱ تا ۳ نے موقف اپنایا کہ مذکورہ بالا نوٹیفیکیشن غیر آئینی اور غیر قانونی ہیں۔ آئین پاکستان میں درج فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے حصہ دوم کے انٹری ۱۲ کے مطابق ہائیر ایجوکیشن کے اداروں میں معیارات کا تعین صرف اور صرف وفاقی مقننہ کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ اس لئے صوبائی مقننہ دفعہ ۱۳ [۲] اور [۴] یونیورسٹی آف پنجاب ایکٹ ۱۹۷۳ کے ذریعے ہائیر ایجوکیشن کے اداروں میں معیارات کا تعین نہیں کر سکتی۔ فاضل عدالت ماتحت نے ۱۲ نومبر ۲۰۱۶ کو فیصلہ سناتے ہوئے یونیورسٹی آف پنجاب ایکٹ ۱۹۷۳ کے دفعہ ۱۳ [۲] اور [۴] کو منسوخ کیا۔ نیز نوٹیفیکیشن ہائیر ایجوکیشن بھی منسوخ ہوئے۔

حکومت کے وکیل کے دلائل:

ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے موقف اپنایا کہ حکومت پنجاب نے ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے بنیادی ہدایات پر عمل کیا ہے۔ نیز بنیادی ہدایات سے آگے بڑھ کر معیارات کو مزید بہتر کیا ہے، تاہم عدالت ماتحت نے اس امر کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا۔ عدالت ماتحت کے فیصلے میں اس اہم سوال کی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ صوبائی حکومت نے کیسے ایچ ای سی کی بنیادی ہدایات کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا مذکورہ دفعہ ۱۳ اور ہائیر ایجوکیشن آرڈیننس ۲۰۰۲ میں

کوئی تضاد موجود نہ ہے۔ دونوں قوانین بیک وقت موجود رہ سکتے ہیں جب تک ایچ ای سی کی بنیادی ہدایات کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔

ایڈووکیٹ جنرل نے مزید دلائل دیئے کہ اٹھارویں ترمیم کے بعد ایجوکیشن فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ میں نہیں آتا۔ پس ایجوکیشن کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار صوبائی حکومتوں کا ہے۔ ایجوکیشن کے معنی میں اعلیٰ تعلیم بھی آتی ہے۔ وفاق محض بنیادی معیار کا تعین کر سکتی ہے۔ فاضل وکیل عامر سہیل نے اعتراض اٹھایا کہ مذکورہ فیصلہ اٹھارویں ترمیم کے بعد صوبائی حکومتوں کی خود مختاری پر قدرغن لگاتا ہے۔

پرائیویٹ درخواست گزار نمبر ۳۳۱ کے دلائل:

فاضل وکیل نے موقف اختیار کیا کہ فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے حصہ دوم کی انٹری نمبر ۱۲ کے تحت اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں معیارات کے تعین کا اختیار صرف اور صرف وفاقی مقننہ کو حاصل ہے۔ پس دفعہ ۱۴ [۲] اور [۴] خلاف آئین ہو کر قابل منسوخی ہیں۔ اسی طرح نوٹیفیکیشن ہائے بھی خلاف قانون ہو کر قابل منسوخی ہیں۔

سپریم کورٹ نے پہلے سوال کے حل کے لئے اٹھارویں ترمیم کی طرف رجوع کیا: اٹھارویں ترمیم کے بعد تعلیم فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کا حصہ نہ ہو کر بقایا لسٹ کا حصہ بنا۔ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۴۲ [سی] کے تحت تعلیم پر قانون سازی کا اختیار صرف صوبائی مقننہ کو حاصل ہوا۔ تاہم فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے حصہ دوم انٹری ۱۲ کے تحت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معیار کے تعین کا اختیار وفاق کے حصے میں آیا۔ تعلیم کے معنی میں اعلیٰ تعلیم بھی شامل ہے، لہذا اگر ایک طرف اعلیٰ تعلیمی اداروں کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار وفاق کو حاصل ہے تو دوسری طرف تعلیم بشمول اعلیٰ تعلیم سے متعلق قانون سازی کا اختیار صوبوں کو بھی حاصل ہے۔

آرٹیکل ۱۴۲ [اے] پاریمان کو فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ میں درج معاملات کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار بلا شرکت غیرے دیتا ہے۔ اسی طرح آرٹیکل ۱۴۲ [سی] صوبوں کو "ریزیڈوری" یعنی دیگر معاملات کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار بلا شرکت غیرے دیتا ہے۔

لیکن جب کسی معاملے [مثلاً تعلیم] پر قانون سازی کا اختیار وفاق اور صوبے دونوں کے پاس ہو تو ایسی صورت میں فیڈرلزم/وفاقیت کے اصول کے تحت دونوں بیک وقت قانون سازی کر سکتے

ہیں۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد وفاق صوبے کی قانون سازی کے اختیار کو ختم بھی نہیں کر سکتی۔ تاہم جب وفاقی اور صوبائی قوانین میں تطبیق ممکن نہ ہو اور نکلراؤ ناگزیر ہو تو ایسی صورت میں وفاقی قانون کو آرٹیکل ۱۴۳ کے تحت ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

فیڈرلزم اور کوآپریٹو فیڈرلزم:

فیڈرلزم ایسے نظام حکومت کو کہتے ہیں جس میں اختیارات مرکزی اور علاقائی حکومتوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ اسی فیڈرلزم کو عملاً چلانے کے لئے کوآپریٹو فیڈرلزم حرکت میں آتی ہے جو مرکزی، صوبائی اور بلدیاتی حکومتوں کے اختیارات، وسائل اور پروگرامات کو یکجا کر کے عوام کو بہتر خدمات فراہم کرتی ہے۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد کوآپریٹو فیڈرلزم اور صوبائی خود مختاری ہماری آئین کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جن سے عدالتیں آئین کی تشریح میں مدد لے سکتی ہیں۔

موجودہ کیس میں ایک طرف اعلیٰ تعلیمی اداروں کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار وفاق کو حاصل ہے تو دوسری جانب تعلیم بشمول اعلیٰ تعلیم سے متعلق قانون سازی کا اختیار صوبوں کو بھی حاصل ہے۔ اس مسئلے کو کوآپریٹو فیڈرلزم اور صوبائی خود مختاری کے اصولوں کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے۔

انٹری نمبر ۱۲ کی وسعت بس اتنی ہے کہ یہ اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے ملک میں موجود تمام اداروں پر بنیادی اور کم از کم معیارات لاگو کرتی ہے جو کہ قومی وحدت اور یکجہتی کی عکاس ہیں۔ پس صوبے ان بنیادی معیارات سے صرف نظر نہیں کر سکتی ہیں، تاہم صوبے ان معیارات سے آگے بڑھ کر اپنے لئے اعلیٰ معیارات قائم کر سکتی ہیں۔

فاضل سٹنگل جج نے فیڈرل لیجسلیچر کے اختیارات بلا شرکت غیرے پر ضرورت سے زیادہ انحصار کیا ہے اور فیڈرلزم اور کوآپریٹو فیڈرلزم جیسے آئین کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کیا ہے جو کہ آرٹیکل ۱۴۲ پر راجح ہیں۔ پس ایچ ای سی آرڈیننس محض بنیادی معیارات تجویز کرتا ہے، جبکہ دفعہ ۱۴ مذکورہ ایکٹ وائس چانسلر کی تعیناتی کے لئے تعلیم اور تجربہ وغیرہ کو مشروط کرتا ہے۔ لہذا دونوں قوانین میں کوئی تضاد موجود نہ ہے۔ سٹنگل جج کا یہ قرار دینا کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے حوالے سے قانون سازی کا اختیار زیر انٹری نمبر ۱۲ صرف اور صرف فیڈرل لیجسلیچر کے دائرہ کار میں آتا ہے، قابل بحالی نہ ہے کیونکہ ایچ ای سی آرڈیننس محض بنیادی معیارات تجویز کرتا ہے۔

دوسرا سوال:

آئیے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ایچ ای سی آرڈیننس کے دفعہ ۱۰ کی طرف رجوع کرتے ہیں:

دفعہ ۱۰ ایچ ای سی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ فیکٹی کی تعیناتی کے لئے بنیادی یا کم از کم معیارات اور قابلیت کے حوالے سے گائیڈ لائنز یعنی ہدایات تیار کریں، نصاب بنانے میں اداروں کی راہنمائی کریں اور اداروں کا نظم و نسق بہتر انداز میں چلانے کے لئے بنیادی معیارات قائم کرے۔ پس یہ آرڈیننس بنیادی معیارات کے حوالے سے صرف ہدایات دیتا ہے جو کہ صوبائی حکومتوں اور یونیورسٹیوں پر لازم نہیں ہیں۔ لہذا ایچ ای سی آرڈیننس ۲۰۰۲ میں درج اعلیٰ تعلیمی اداروں سے متعلق معیارات ہدایتی نوعیت کی ہیں۔ تاہم اگر یہ ہدایات لازمی بھی ہوتی، تب بھی کوآپریٹو فیڈرلز کے اصول کے تحت ان کی ایسی تشریح کی جاتی جو وفاق اور صوبے کے درمیان تعاون بڑھانے میں مددگار ہوتی اور دونوں وفاقی اور صوبائی معیارات قائم رہتیں۔ صرف ناگزیر کمرآؤ کی صورت میں آرٹیکل ۱۴۳ کے تحت وفاقی قانون کو ترجیح دی جاتی۔

عدالت کا فیصلہ:

1. وفاق اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معیارات کے حوالے سے زیر انٹری نمبر ۱۲ قانون سازی کر سکتی ہے، تاہم یہ بنیادی اور کم از کم معیارات ہونگے۔ ساتھ ہی صوبے بھی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معیارات کے حوالے سے قانون سازی کر سکتی ہیں۔ صوبے اپنے لئے مزید اعلیٰ معیارات کا تعین کر سکتی ہیں، تاہم وفاق کے بنیادی معیارات سے کم معیارات کا تعین نہیں کر سکتی۔
2. ایچ ای سی آرڈیننس ۲۰۰۲ یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کی تعیناتی کے لئے بنیادی اور غیر لازم ہدایات دیتی ہے۔ پس صوبے وائس چانسلر کی تعیناتی کے لئے معیارات، قابلیت، وغیرہ کے حوالے سے قانون سازی کر سکتی ہیں۔ اگر مستقبل میں فیڈرل یجسٹریٹو لسٹ کے حصہ دوم، انٹری ۱۲ کے تحت لازمی بنیادی ہدایات دی جاتی ہے تو صوبائی حکومتوں پر ان معیارات کو یقینی بنانا لازمی ہوگا، تاہم اس صورت میں بھی یہ ہدایات صوبوں کو مزید اعلیٰ معیارات کے تعین سے نہیں روکے گی۔

3. دفعہ ۱۴ [۲] و [۴] یونیورسٹی آف پنجاب ایٹ، ۱۹۷۳ خلاف آئین نہ ہیں۔
4. اسی طرح ہائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، حکومت پنجاب کے جاری کردہ نوٹیفیکیشن ہائے محررہ ۳ مارچ ۲۰۱۵ اور ۷ اپریل ۲۰۱۵ بھی خلاف آئین و قانون نہ ہیں۔ وائس چانسلر کی پوسٹ پر آئندہ تعیناتی کے لئے مذکورہ بالا نوٹیفیکیشن ہائے پر عمل کرنا لازمی ہوگا۔
5. کونسل آف کامن انٹرسٹ کا کردار پچھلے چند سالوں سے غیر فعال رہا ہے۔ لہذا کونسل کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایچ ای سی کے بنائے ہوئے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے حوالے سے معیارات پر نظر ثانی کریں اور ۶ ماہ کے اندر اندر انھیں آئین کے ساتھ مطابقت میں لائے۔
6. نیز وفاقی حکومت اور ایچ ای سی کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ایچ ای سی آئندہ کونسل آف کامن انٹرسٹ کے زیر سایہ کام کرے گی اور ایچ ای سی کی کوئی پالیسی یا ضابطہ اس وقت تک قانونی طور پر لازم نہیں ہوگا جب تک کونسل آف کامن انٹرسٹ اس کی منظوری نہ دیں۔

نیز عدالت نے حکومت کو ہدایت دی کہ وہ چاروں یونیورسٹیوں میں سرچ کمیٹی ہی کی سفارشات کی بنیاد پر تین اشخاص کے پینل میں سے وائس چانسلر کو منتخب کریں۔ تاہم مستقبل میں پنجاب میں تمام تریونیورسٹیوں میں تعیناتی اسی فیصلے میں وضع کئے گئے قانون کے مطابق کی جائے گی۔ عدالت نے اپیل ہذا منظور کرتے ہوئے حکم و فیصلہ زیر نزاع منسوخ کیا۔

خلاصہ:

اگر کسی معاملے میں قانون سازی کا اختیار بیک وقت وفاق اور صوبے دونوں کو حاصل ہو تو ایسی صورت میں فیڈرلزم، کوآپریٹو فیڈرلزم اور صوبائی مختاری جیسے آئینی اصولوں کی روشنی میں ایسی تشریح کی جائے گی کہ وفاقی اور صوبائی قوانین دونوں قائم رہے۔ تاہم اگر ٹکراؤ ناگزیر ہو اور تطبیق ممکن نہ ہو تو پھر آرٹیکل ۱۴۳ کے تحت وفاقی قانون کو ترجیح حاصل ہوگی۔

موجودہ کیس میں وفاق اور صوبہ دونوں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معیارات کے تعین کے حوالے سے قانون سازی کے اختیارات رکھتے ہیں۔ ایچ ای سی آرڈیننس ۲۰۰۲ یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کی تعیناتی کے لئے محض بنیادی اور غیر لازم ہدایات دیتی ہے۔ صوبے وائس چانسلر کی

تعییناتی کے لئے معیارات، قابلیت وغیرہ کے حوالے سے قانون سازی کر سکتی ہیں۔ پس یونیورسٹی آف پنجاب ایکٹ، ۱۹۷۳ کے دفعات ۱۴[۲] و ۱۴[۳] خلاف آئین نہ ہیں۔ نیز ہائیر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، حکومت پنجاب کے جاری کردہ نوٹیفیکیشن بھی خلاف آئین نہ ہیں۔

مشہور زمانہ کیس، مسماۃ شہلا ضیاء بنام واپڈا، کا خلاصہ²⁸

ریاض احمد برٹ²⁹



کیس کے مختصر حقائق:

۱۹۹۱ میں واپڈا ایف-۶[۱] اسلام آباد میں بجلی گھر کی تعمیر کا منصوبہ شروع کرتی ہے۔ اس کے خلاف وہاں کے چند باشندے ایک خط میں چیئرمین واپڈا کو اس منصوبے کے برے اثرات سے مطلع کرتے ہیں۔ جس کے خاطر خواہ نتائج نہ نکلنے پر ڈاکٹر طارق بنوری یہ خط عدالت عظمیٰ کو بھیجتا ہے کہ یہ انسانی حقوق کا کیس ہے، جس سے بڑے پیمانے پر عوام متاثر ہو سکتی ہے، اس لیے اس پر نوٹس لیا جائے، کیونکہ:

1. یہ منصوبہ عوام کی رضامندی کے بغیر شروع ہوا ہے۔
2. اس بجلی گھر کی وجہ سے الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ وافر مقدار میں پیدا ہوتا ہے جو انسانی زندگی، خصوصاً بچوں کے لئے مضر ہے۔
3. یہ منصوبہ اسلام آباد کے گرین بیلٹ میں تعمیر کیا جا رہا ہے۔

²⁸ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے معزز جج سلیم اختر صاحب نے لکھا ہے اور اس کو "پی ایل ڈی ۱۹۹۴ سپریم کورٹ ۱۹۹۳" کے حوالے سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

²⁹ ممبر ٹیم آئین و قانون و طالب العلم الشریعہ لاء بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

عدالت کیس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے واپڈا کو نوٹس جاری کرتی ہے اور اس کے بعد عدالتی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوالات:

1. بجلی گھر سے پیدا ہونے والا الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ فی الواقع انسانی صحت کے لئے مضر ہے اور کیا یہ آئین پاکستان کے ”آرٹیکل ۹ حق زندگی“ سے متصادم ہے؟
2. کیا یہ پٹیشن ۱۸۴ [۳] کے تحت برقرار رکھنے کے قابل ہے؟

پہلا سوال:

مدعیان کے دلائل:

اپنے دعویٰ کے حق میں پیشینہز امریکہ، سویڈن اور کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ممالک کے مختلف رسالہ جات، ریسرچ آرٹیکلز اور سائنسدانوں کی آراء پیش کرتے ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ زیادہ وولٹیج والی بجلی کی تاروں سے الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ پیدا ہوتی ہے جو انسانوں میں بلڈ کینسر، دماغی رسولیاں، ڈپریشن، ہڈیوں کے نشوونما کو متاثر کرنا، دماغی خلیوں کے مابین نظام ترسیل کو متاثر کرنا، سفید خونی خلیوں کو متاثر کرنا، دل کے امراض اور بچوں میں کینسر جیسے متعدد موذی امراض کا باعث بنتی ہے۔

اس مد میں ڈاکٹر طارق بنوری نے بھی اپنی رائے دی کہ "چونکہ ابھی تک پاکستان میں اس مسئلے پر تحقیق نہیں ہوئی۔ پاکستان میں اس پر تحقیق کرنا مشکل اور مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ان صورتحال میں ہم ترقی یافتہ ممالک کی ریسرچ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

اگر دو ریسرچ ہوں، ایک یہ بتاتی ہو کہ الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ سے انسانی زندگی اور ماحول کے لئے خطرہ ہے اور دوسری میں ان خطرات کی نفی کی گئی ہو۔ ہمیں پہلی ریسرچ پر عمل کرنا چاہیے تاکہ احتیاطی تدابیر کی جاسکے۔ ترقیاتی منصوبوں اور ماحول کے لئے خطرات میں اعتدال پیدا کیا جائے کہ ماحول کو زیادہ نقصان بھی نہ ہو اور ترقیاتی کام بھی ہوتے رہیں۔"

مدعی کے وکیل نے ماحول کی حفاظت ”ریوڈیکلریشن“³⁰ کے اصول نمبر ۱۵ کا حوالہ دیا، جو ممالک پر لازم کرتا ہے کہ خواہ کسی امر سے ماحول کے لئے خطرے کا امکان موجود ہو لیکن اس پر حتمی تحقیق نہ بھی ہو، اس کے باوجود بھی ماحول کی حفاظت کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ پاکستان اس قرار داد کا دستخط کنندہ ہے مگر باقاعدہ اس کو ”ریٹیفائی“³¹، نہیں کیا، اس لئے اس کی تعمیل پاکستان پر لازم نہیں۔ لیکن ماحول چونکہ عالمی مسئلہ ہے اس لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پاکستان پر لازم ہیں۔

واپڈا کے دلائل:

واپڈا بھی اپنے حق میں مختلف بیرونی ممالک کی ریسرچ کو بطور دلیل پیش کرتی ہے، کہ الیکٹرو میگنیٹک فیئڈ کی وجہ سے انسانی صحت پر مہلک اثرات مرتب ہونے کے امکانات موجود ہیں، لیکن یہ ریسرچ نہ تو حتمی ہے نہ ہی اس پر قطعی شواہد ہیں۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر خاص وقت کے لئے اور خاص مقدار میں الیکٹرو میگنیٹک فیئڈ موجود ہو تو یہ صحت کے لئے مضر نہیں۔ دونوں فریق کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد معزز عدالت یہ بتاتی ہے کہ پٹیشنرز نے جدید ریسرچ سٹڈیز سے استدلال کیا ہے جبکہ واپڈا کی طرف سے پیش کیے گئے سٹڈیز دو دہائی پرانے ہیں۔ اس لئے واپڈا پر لازم ہے کہ وہ جدید تکنیکی اور سائنسی تحقیقات سے آگاہ رہے تاکہ وہ بر وقت احتیاطی تدابیر اختیار کر سکے۔

حالانکہ اس ریسرچ میں صحت اور ماحول کے لئے خطرہ حتمی طور پر معلوم نہیں، اس مد میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس لئے عدالت اس پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں سناسکتی۔ پھر بھی چونکہ ترقی یافتہ ممالک اس معاملے میں احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں ہمیں بھی چاہئے کہ انسانی صحت اور ماحول کی حفاظت کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور عوام کے حقوق اور ان کے فلاح و بہبود کے کاموں میں اعتدال پیدا کریں۔

دوسرا سوال:

³⁰Rio Declaration on Environment and Development, 1992.

³¹ Ratify

واپڈا کے وکیل کی جانب یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہاں یہ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۸۳ [۳] کے تحت یہ پیشین دائر نہیں کی جاسکتی۔

کیونکہ یہ منصوبہ باقاعدہ ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد شروع کیا گیا ہے، نہ تو اس کی وجہ سے لوگوں کی صحت کے لئے خطرہ موجود ہے، نہ ان کی پراپرٹی کے لئے نقصان دہ ہے اور نہ ہی کوئی اور بنیادی حق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

اس پر معزز عدالت یہ بتاتی ہے کہ موجودہ مسئلہ بڑے پیمانے پر عوام کی فلاح و بہبود اور حفاظت سے منسلک ہے۔ بجلی کی تاریں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک طرف معاشی و صنعتی ترقی ناگزیر ہے تو دوسری طرف عوام کی صحت اور ماحول کی حفاظت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بجلی گھر کی وجہ لوگوں کے "جینے کا حق متاثر ہوتا ہے جو ان کو آئین پاکستان کا آرٹیکل ۹ دیتا ہے۔ عدالت اس میں "زندگی" کی تعریف کرتے ہوئے اس کا مفہوم محض مادی طور پر زندہ رہنے سے بہت وسیع کر دیتی ہے۔

زندگی کی تعریف پاکستانی آئین میں کہیں پر بھی موجود نہیں پھر بھی مختلف لغات اور بیرونی دساتیر کی روشنی میں اس کی تعریف کی جاتی کہ جینے کے حق میں ہر وہ آسائش اور سہولت شامل ہے جو آپ کو کسی بھی آزاد ریاست میں دستیاب ہوتی ہیں۔

اس میں انسان کا حق حصول تعلیم، حق تزویج، حق تعمیر گھر، بچے پیدا کرنے کا حق، عقد کرنے کا حق وغیرہ کے ساتھ ساتھ الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ کے مضر اثرات سے حفاظت اور پرسکون زندگی گزارنا شامل ہے۔

ہر وہ مداخلت جو بنیادی حقوق کی ضد ہو وہ جینے کے حق کی بھی ضد ہے۔ اس لئے اس بجلی گھر سے پیدا ہونے والے برے اثرات بنیادی حق، حق زندگی کی خلاف ورزی ہے۔

پیشینمز کے وکیل ڈاکٹر پرویز حسن نے ہندوستان کی عدلیہ کے چند فیصلوں کا بھی حوالہ دیا جس میں کچھ منصوبوں کے خلاف پیشینمز کو ۱۸۳ [۳] کے تحت سنا گیا اور ان منصوبوں کو اس لئے روکا گیا وہ ماحول اور انسانی صحت کے لئے مضر تھے۔

عدالت کا فیصلہ:

دونوں فریقین کے دلائل کو ملاحظہ کرنے کے بعد عدالت حتمی فیصلہ سنانے سے پہلے ”نہیں پاک“ کو بطور کمیشن تعینات کرتی ہے کہ وہ اس منصوبے اور واپڈا کے طریقہ کار کا مکمل جائزہ لے اور اس پلان میں ضروری تبدیلی اور ترمیم تجویز کرے۔ اس مقصد کے لئے اگر پیشتر معاون دستاویزات دینا چاہے تو دو ہفتے کے اندر دے سکتی ہے، جبکہ واپڈا اس منصوبے کے متعلق ساری معلومات فراہم کرے گی۔ یہ کمیشن اپنی رپورٹ چار ہفتے کے اندر جمع کرے گی۔

مستقبل میں واپڈا اس طرح کی تنصیبات اور بجلی گھروں کی تعمیر سے پہلے لوگوں کو بذریعہ اخبار، ریڈیو یا ٹی وی مطلع کرے گی اور ان کی شکایات سنے گی۔ یہ طریقہ کار اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حکومت اس مقصد کے لئے کمیشن نہیں بناتی۔

خلاصہ:

واپڈا ایف۔۶ [۱] اسلام آباد میں بجلی گھر تعمیر کرنے کا منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے خلاف پٹیشن عدالت عظمیٰ میں لائی جاتی ہے۔ فریقین کے دلائل سنے جاتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایکٹرو میکانیک فیلڈ کی وجہ سے انسانی صحت اور ماحول کے خطرات کا امکان ہے لیکن اس پر حتمی تحقیق موجود نہیں۔ عدالت لوگوں کی صحت اور ماحول کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس امر کی تحقیق کے لئے ”نہیں پاک“ کو بطور کمیشن تعینات کرتی ہے کہ وہ منصوبے، واپڈا کے طریقہ کار اور بجلی گھر کے مقام کا مکمل طور پر جائزہ لے کر رپورٹ عدالت میں جمع کرائے۔ واپڈا مزید ایسے منصوبہ جات سے پہلے کمیشن کی اجازت طلب کرے گی۔

شفعہ کے کیس میں اضافی ٹیکس یعنی فیس مقررہ مدت میں جمع نہ کرنے کی بناء پر شفعہ کے مقدمہ کی

اخراج کے حوالے سے عدالت عالیہ پشاور کا اہم فیصلہ³²

ایمن قاسم³³



کیس کے حقائق:

قرحیت نامی درخواست گزار ۲۲ اگست ۲۰۰۷ کو حق شفعہ کے نفاذ کے ذریعے قبضے کا مقدمہ دائر کرتے ہیں، جس کے جواب میں عدالت جواب دہندہ / مدعا علیہ کو طلب کرتی ہے۔ تاہم طلبی کے باوجود مدعا علیہ حاضر نہیں ہوتا۔ لہذا عدالت مدعی کو یکطرفہ طور پر ثبوت پیش کرنے کی اجازت دیتی ہے جس کی مدعی تعمیل کرتا ہے اور بالآخر ۲۵ مئی ۲۰۰۹ کو عدالت یکطرفہ فیصلہ اور حکم نامہ جاری کرتا ہے۔ جس کے تحت عدالت مدعی کے حق میں اس شرط کے ساتھ فیصلہ سناتی ہے کہ دو تہائی بیٹنگی رقم تیس دن کے اندر جمع کرے۔ اس کے ساتھ ہی عدالت اس کو اس بات کا بھی پابند بناتی ہے کہ وہ مطلوبہ اضافی ٹیکس / فیس بھی ادا کرے۔ مذکورہ بالا حکم کی تعمیل میں عرضی گزار تیس دن کے اندر یعنی ۲۳ جولائی ۲۰۰۹ کو دو تہائی کے حساب سے شفعہ کی رقم جمع کرتا ہے لیکن اس کے بعد ہوتا کچھ یوں ہے کہ مدعا علیہ ۲ مارچ ۲۰۱۰ کو ٹرائل کورٹ میں یکطرفہ فیصلے کے خلاف درخواست دائر کرتا ہے جس کو ٹرائل کورٹ ۱۳ اپریل ۲۰۱۰ کو خارج کرتا ہے۔ جس کے بعد مدعا علیہ اس حکم کو اپیلیٹ کورٹ میں چیلنج کرتا ہے اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ہری پور مورخہ ۱۳ اپریل ۲۰۱۰ کو مذکورہ بالا درخواست کی اجازت دیتے ہیں اور مدعا علیہ کی درخواست کو ٹرائل کورٹ لوٹا دیتے ہیں تاکہ شواہد کو ریکارڈ کر کے کارروائی کو نئے سرے سے شروع کیا جائے۔ اس پوسٹ ریمانڈ کارروائی کے دوران مدعا علیہ اس بناء پر مقدمہ خارج کرنے کی درخواست کرتا ہے کہ مدعی نے وہ ٹیکس / فیس ۳۰ دن کے اندر جمع نہیں کیا جس کی ادائیگی کا حکم عدالت نے ۲۵ جون ۲۰۰۹ کو دیا تھا۔ چنانچہ مدعا

³² یہ فیصلہ عدالت عالیہ پشاور کے فاضل جج، جسٹس محمد اعجاز خان صاحب نے لکھا ہے جب کہ اس فیصلے کو عدالت عالیہ کی

ویب سائٹ پر "سول ریویشن نمبر ۳۳۷۳-۱۷۱ کے طور پر پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

³³ طالب علم، شریعہ اینڈ لا، اسلامیہ کالج یونیورسٹی، پشاور۔

علیہ اس کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ۱ کے سامنے اپیل دائر کرتا ہے جو کہ ۱۳ اپریل ۲۰۱۰ کو اس اپیل کی اجازت دیتے ہیں اور مدعی کا مقدمہ اس بناء پر خارج کرتے ہیں کہ وہ تیس دن کے اندر مطلوبہ ٹیکس/فیس جمع کرنے میں ناکام رہا۔ اس حکم کے خلاف مدعی پشاور ہائی کورٹ میں فوری نظر ثانی کی درخواست دائر کرتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

اب فاضل عدالت کے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا دو تہائی رقم کے ساتھ مطلوبہ ٹیکس/فیس بھی تیس دن کے اندر جمع کرنا لازم ہے اور کیا اس کی عدم ادائیگی مقدمے کو خارج کرنے کا جواز بن سکتی ہے؟

عدالت کا استدلال:

مدعا علیہ کا اعتراض یہ ہے کہ چونکہ ٹرانس کورٹ نے مدعی کو دو تہائی رقم کے ساتھ اضافی ٹیکس/فیس دینے کا بھی پابند کیا تھا لہذا مدعی نے دو تہائی رقم تو تیس دن کے اندر جمع کر دی مگر اضافی ٹیکس/فیس جمع کرنے میں ناکام رہا۔ جبکہ مدعی کا موقف یہ ہے کہ اس نے دو تہائی رقم تیس دن کے اندر جمع کر دی اور چونکہ ایک طرف اضافی ٹیکس/فیس کی ادائیگی کی سمت غیر یقینی تھی اور دوسری جانب مذکورہ ٹیکس/فیس کی تیس دن کے اندر ادائیگی کی کوئی صورت ظاہر نہیں ہوئی، اگرچہ یہ رقم بھی مدعی نے ۲۰ اگست ۲۰۰۹ کو جمع کر دی تھی۔ لہذا اپیلیٹ کورٹ نے مدعی کے مقدمے کو غلط طریقے سے برطرف کیا۔

عدالت کیس کے حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ یہ بات تو دونوں فریقین قبول کرتے ہیں کہ مدعی نے دو تہائی رقم ۳۰ دن کے اندر جمع کی ہے مگر اضافی ٹیکس/فیس کو تیس دن کے اندر جمع نہیں کیا گیا۔ ٹرانس کورٹ کے ایک طرف فیصلے کے مطابق مدعی کو حکم دیا گیا کہ وہ تیس دن کے اندر پری اپیمپشن کی دو تہائی رقم جمع کرے البتہ اضافی ٹیکس/فیس کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ٹرانس کورٹ کے فیصلے میں کسی قسم کی پہلے سے طے شدہ نافذ العمل شق موجود نہیں ہے جس کے تحت اگر اضافی ٹیکس/فیس تیس دن کے اندر جمع نہ کیا گیا تو مقدمہ خارج ہوگا۔ اور علم اصول قوانین کے مطابق فرمان میں پہلے سے طے شدہ نافذ العمل شق کی غیر موجودگی کی صورت میں مقدمہ کسی عمل کو پورا کرنے کی ناکامی کے تحت خارج نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت ۲۵ جون ۲۰۰۹ کے فیصلے کے نتائج میں ٹرانس کورٹ کی بنائی ہوئی فرمان شیٹ کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مذکورہ شیٹ اس قسم کی شرط کے بارے میں خاموش ہے۔ اور چونکہ دونوں فریقین اس فرمان کے پابند ہیں لہذا اس شرط کی غیر موجودگی کی وجہ سے مدعی کی ٹیکس/فیس کی عدم ادائیگی مقدمے کو خارج نہیں کر سکتی۔ لہذا اس بناء پر بھی اپیلیٹ کورٹ نے قانون میں غلطی کر کے مدعی کے مقدمے کو خارج کیا۔

اس کے بعد عدالت اس کیس کے قانونی عنصر کے ذکر کی طرف آتی ہے کہ شفعہ کا مقدمہ خیبر پختون خواہ پر ی- ایجنٹس ایکٹ ۱۹۸۷ کے دفعہ ۲۴ اور ۲۵ اور مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۲۰ اور ۴ کے تحت چلتا ہے۔ دفعہ ۲۴ کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مدعی عدالت کے طے کردہ مدت میں ایک تہائی رقم کی ادائیگی میں ناکام ہو جائے تو مقدمہ خارج ہو جائے گا، البتہ سیکشن ۲۵ میں اس قسم کی کوئی شق موجود نہیں جس کے تحت اگر کوئی عدالت کی جانب سے طے شدہ اضافی رقم مذکورہ بالا طے شدہ مدت میں جمع نہ کرے تو مقدمہ خود بخود خارج ہو جائے گا۔ آرڈر ۲۰ رول ۱۴ کے تحت خریداری کی رقم کا حکم مدعی پر لازم ہے اور اس کی عدم ادائیگی سے مقدمہ خارج ہو سکتا ہے۔ لہذا اس آرڈر کے تحت بھی فاضل اپیلیٹ کورٹ نے قانون میں غلطی کر کے مدعی کا مقدمہ خارج کیا۔ اس کے علاوہ عدالت دفعہ ۲۴ اور ۲۵ کے ہدایتی اور لازمی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بہت سارے کیسز میں عدالتی منشور ہے کہ دفعہ ۲۴ لازمی جبکہ دفعہ ۲۵ ہدایتی نوعیت کا حامل ہے۔ مزید عدالت چند کیسز کی نظیر دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کیسز میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ دفعہ ۲۴ دفعات لازمی ہے اور اگر ایک مرتبہ مقرر ہو گئے تو دوبارہ نہیں بڑھائے جاسکتے۔ جبکہ دفعہ ۲۵ کے دفعات ہدایتی ہے اور اگر عدالت کیس کے لحاظ سے مناسب سمجھیں تو اس مدت کو بڑھا سکتا ہے۔ لہذا کیس میں مدعی نے دو تہائی رقم اپنی پیشکش پر رقم مقررہ مدت کے اندر جمع کر دی تھی جبکہ مدعا علیہ کا اعتراض محض مطلوبہ ٹیکس / فیس کی ۳۰ دن کے اندر عدم ادائیگی پر ہے۔ اس کے علاوہ عدالت ایک اور سوال کو بھی زیر غور لاتی ہے کہ کیا ٹرائل کورٹ کے پاس قانونی طور پر یہ اختیار تھا کہ وہ اضافی ٹیکس / فیس کا حکم جاری کرے؟ تو آرڈر ۲۰ رول ۱۴ کے مطابق اس کا جواب نفی ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا قوانین کے تحت ٹرائل کورٹ بلا معاوضہ خریداری اور لاگت کے متعلق ہدایت جاری کر سکتا ہے۔ فرمان شیٹ کے مطابق ٹرائل کورٹ نے مقدمے کے اخراجات کا بھی تعین نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اضافی ٹیکس / فیس کے متعلق ٹرائل کورٹ کی ہدایت اس کے قانونی اختیارات سے تجاوز ہے اور ساتھ میں غیر یقینی بھی ہے کہ آیا یہ ٹیکس / فیس کوئی خاص رقم ہے یا یہ وہ رقم ہے جو ونڈی پری لیٹیشن ڈیسٹریبیوٹن کے وقت ادا کرتا ہے، یا یہ وہ رقم ہے جو پری ایپیلر میوٹیشن کے تصدیق کے وقت ادا کرتا ہے؟ لہذا یہ ٹرائل کورٹ کی بے اختیار ہے اور اس ٹیکس / فیس کی عدم ادائیگی کے لیے مدعی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

آخر میں عدالت کیس کے میرٹ پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مدعا علیہ طلبی کے باوجود عدالت میں پیش نہ ہوا جس کے نتیجے میں مدعی کو کیسٹرنہ حکم دیا گیا جس کے خلاف مدعا علیہ نے درخواست دائر کی جس کی بناء پر اپیلیٹ کورٹ نے اس کی درخواست قبول کی اور ٹرائل کورٹ کو دوبارہ فیصلہ کرنے کی ہدایت دی۔ ابھی یہ معاملہ زیر

کارروائی تھا کہ مدعا علیہ نے مدعی کے مقدمے کو خارج کرنے کی درخواست کی اس بناء پر کہ مدعی نے مطلوبہ ٹیکس / فیس ۳۰ دن کے اندر جمع نہیں کیا۔ لہذا مدعا علیہ ایک ہی وقت دوریمیڈیز حاصل نہیں کر سکتا۔ لہذا اس بناء پر بھی اپیلیٹ کورٹ نے قانون میں غلطی کر کے مدعی کے مقدمے کو خارج کیا۔

مذکورہ بالا بحث اور قوانین کی تشریح کو مد نظر رکھتے ہوئے عدالت فوری نظر ثانی کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اپیلیٹ کورٹ کے آرڈر بہ مورخہ ۱۳ جولائی ۲۰۱۱ کو برخاست کرتا ہے اور فاضل ٹرائل کورٹ کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ۶ ماہ کے اندر اس کارروائی کا نتیجہ اخذ کریں۔

خلاصہ:

پشاور ہائی کورٹ کا مندرجہ بالا فیصلہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس فیصلے میں جہاں ایک طرف خیر بچتون خواہ، پری-ایمپشن ایکٹ ۱۹۸۷ کے دفعہ ۲۴ اور ۲۵ اور آرڈر ۲۰ رول ۱۳ کے دفعات کی نوعیت کو واضح کیا گیا تو دوسری جانب پری ایمپشن کے کیسز میں ٹرائل کورٹ کے قانونی اختیارات کو بھی مزید واضح کیا۔ اور سب سے اہم یہ کہ اس فیصلے سے یہ اخذ ہوا کہ پری ایمپشن کے کیس میں اضافی ٹیکس / فیس مقررہ مدت میں جمع نہ کرنے کی بناء پر مقدمہ خارج نہیں کیا جاسکتا۔

سپریم کورٹ کا غیر ملکی ثالثی ایوارڈز سے متعلق ایک اہم فیصلہ³⁴

فیصل شہزاد غفاری³⁵



کیس کے حقائق :

ایک جاپانی کمپنی [ٹیسٹی] کو ۲۰۰۶ میں نیشنل ہائی وے اتھارٹی کی طرف سے بلوچستان میں ایک پروجیکٹ دیا گیا۔ مئی ۲۰۰۷ میں جاپانی کمپنی نے اس پروجیکٹ کے کچھ حصوں پر کام کرنے کیلئے ایک پاکستانی کمپنی [اے ایم سی] سے ایک ذیلی معاہدہ کیا اور اس میں یہ طے پایا کہ معاہدہ پاکستانی قانون کے مطابق روبہ عمل ہوگا اور اختلاف کی صورت میں معاملہ انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس کے ضوابط کے مطابق ثالثی کے ذریعے حل کیا جائے گا۔ اس ذیلی معاہدہ کے مطابق کام کرنے کے دوران ۲۰۰۸ میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے جن کے حل کیلئے [اے ایم سی] نے معاہدے کے مطابق معاملہ انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس سے رجوع کیا۔ سگاپور میں پروسیدنگز کے بعد ثالث نے ستمبر ۲۰۱۱ میں ایوارڈ جاری کر دیا۔

اس پر [اے ایم سی] اس ایوارڈ کے خلاف لاہور سول کورٹ کا رخ کیا اور سیکشن ۱۳ آر بی آریشن ایکٹ، ۱۹۳۰ کے تحت اس کو چیلنج کیا، اس پر [ٹیسٹی] نے عدالت میں جواب جمع کرواتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ لاہور سول کورٹ کے علاقائی اختیارِ سماعت میں نہیں آتا ہے اور مزید یہ کہ یہ اس قانون³⁶ کے تحت ایک فارن ایوارڈ ہے جس کیلئے ہائی کورٹ کو خصوصی اختیارِ سماعت حاصل

³⁴ یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے معزز جج سید منصور علی شاہ نے لکھا ہے۔ اور اس کو بحوالہ سول ایپیل نمبر

۲۲۷ آف ۲۰۱۲ سپریم کورٹ کی ویب سائٹ پر ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

³⁵ ایڈووکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

³⁶ Recognition and Enforcement (Arbitration Agreement and Foreign Award) Act 2011.

ہے۔ سول کورٹ نے [ٹیبی] کے دلائل کو مسترد کرتے ہوئے فیصلہ ان کے خلاف صادر کر دیا جس کو [ٹیبی] نے لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا لیکن ہائی کورٹ نے بھی سول کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا جس پر [ٹیبی] نے اب سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسی دوران [ٹیبی] نے مذکورہ بالا آربریشن ایکٹ، ۲۰۱۱ کی دفعہ ۶ کے تحت سندھ ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس میں ایوارڈ کو فارن ایوارڈ کے طور پر تسلیم کرنے اور نافذ کرنے کی درخواست کی گئی۔ [اے ایم سی] نے دفعہ ۱۱ اور آرڈر ۷، رول ۱۱ مجموعہ ضابطہ دیوانی کا حوالہ دیتے ہوئے درخواست کو مسترد کرنے کی استدعا کی، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے بعد اس کیس پر ”امر فیصل شدہ“³⁷ کا اصول لاگو ہوتا ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کے سنگل بنچ نے [اے ایم سی] کے موقف کی حمایت کی۔ تاہم اس کے خلاف [ٹیبی] نے انٹرا کورٹ اپیل کی جس پر ایک ڈویژن بنچ نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے سامنے زیر التواء اپیل کی وجہ سے یہ معاملہ ”امر فیصل شدہ“ نہیں ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف [اے ایم سی] نے سپریم کورٹ کا رخ کیا اور سپریم کورٹ نے ان دونوں ایپلوں کو اکٹھا کر دیا۔

سپریم کورٹ میں [ٹیبی] کا موقف یہ تھا کہ ایورڈ کو ایک فارن ایوارڈ سمجھا جانا چاہیے اور اس پر ۱۹۳۰ کے ایکٹ کے بجائے آربریشن ایکٹ، ۲۰۱۱ کا اطلاق ہونا چاہیے، جبکہ [اے ایم سی] کا کہنا تھا کہ ایورڈ آربریشن ایکٹ ۲۰۱۱ کے تحت فارن ایوارڈ نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ یہ ایورڈ اس ایکٹ کے تحت فارن ایوارڈ کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ مزید برآں [اے ایم سی] نے یہ موقف اپنایا کہ اگر ایورڈ کو فارن ایوارڈ قرار بھی دیا جائے تو بھی ۲۰۱۱ کے ایکٹ کا اطلاق ماضی سے کرتے ہوئے ۲۰۰۸ میں ہونے والی آربریشن کی پروسیڈنگز پر اس کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے بلکہ آربریشن ایکٹ ۲۰۱۱ کا اطلاق ایکٹ نافذ ہونے کے بعد کی پروسیڈنگز پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوالات:

1. کیا کسی کنٹریکٹنگ ریاست میں ثالثی معاہدے کی رو سے جاری کیے گئے ایورڈ کو "۲۰۱۱ ایکٹ"³⁸ کے تحت فارن اریٹریل ایوارڈ شمار کیا جا سکتا ہے؟
2. کیا مندرجہ بالا ایکٹ کا اطلاق کسی ایسے ایوارڈ پر بھی ہوتا ہے جو اس ایکٹ کی توفیق سے قبل جاری ہو چکا ہو؟

فریقین نے اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیئے اور مختلف عدالتی نظائر کا حوالہ دیا، ایک بہت اہم کیس [ہیناچی] تھا جس پر [اے ایم سی] نے بہت زیادہ انحصار کیا ہوا تھا اور لاہور ہائیکورٹ نے بھی اسی پر انحصار کرتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا۔ تاہم سپریم کورٹ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قانون میں تبدیلیوں کے باعث [ہیناچی] کیس اب اتنا متعلق نہیں رہا کہ اس پر انحصار کیا جا سکے کیونکہ اس کیس میں آربریشن ایکٹ، ۱۹۳۷ کا حوالہ دیا گیا ہے جبکہ اس وقت یہ قانون بدل چکا ہے اور اس کی جگہ ۲۰۱۱ کا ایکٹ لے چکا ہے۔ اس تبدیلی کے باعث ایورڈ کی تقسیم بندی کا قانونی سیاق و سباق بدل چکا ہے۔ سپریم کورٹ نے اس بات کی وضاحت کی کہ آربریشن ایکٹ، ۲۰۱۱ فارن آربریشن ایوارڈ کی واضح تعریف کرتا ہے کہ کنٹریکٹنگ ریاست یا وفاقی حکومت کی جانب سے نوٹیفکڈ ریاست میں دیا گیا ایورڈ فارن ایوارڈ ہے۔ سپریم کورٹ نے اس پر بات پر بھی زور دیا کہ ممکن حد تک بغیر کسی اضافی تشریح کے قانون ساز کی رائے پر سختی سے عمل کرنا چاہیے لہذا آربریشن ایکٹ، ۲۰۱۱ میں دی گئی تعریف کو نافذ کرتے ہوئے مذکورہ کیس میں زیر بحث ایورڈ کو فارن ایوارڈ قرار دیا ہے۔

اس کے بعد معزز عدالت دوسرے سوال کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے متعلق قانونی نکات پر غور کرنا شروع کرتی ہے۔

عدالت نے آربریشن ایکٹ، ۲۰۱۱ کے ماضی سے اطلاق اور اس سے قبل کے آربریشن ایورڈ کے متعلق قانون کا جائزہ لیا۔ اس ضمن میں مذکورہ بالا ایکٹ کے دفعہ [۳] اور [۴] پر زور دیا گیا۔ دفعہ [۳] ایکٹ کے نفاذ کی تاریخ سے پہلے یا بعد میں ہونے والے تمام ثالثی معاہدوں پر

³⁸ Recognition and Enforcement (Arbitration Agreement and Foreign Award) Act 2011.

لاگو ہوتا ہے، جبکہ دفعہ ۱۴[۲] جولائی ۲۰۰۵ سے پہلے فارن آرٹریژن ایوارڈز پر ایکٹ کے نفاذ کو محدود کرتا ہے۔ عدالت نے واضح کیا کہ آرٹریژن ایکٹ، ۲۰۱۱ آرٹریژن معاہدوں پر ماضی سے اطلاق کے لیے کوئی حتمی تاریخ نہیں دیتا لیکن فارن آرٹریژن ایوارڈز پر اس قانون کے نفاذ کی تاریخ ۱۴ جولائی ۲۰۰۵ مقرر ہے جو کہ پاکستان میں فارن آرٹریژن ایوارڈز کی منظوری کے پہلے آرڈیننس کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے۔ کورٹ نے اس پر بھی زور دیا کہ مسلمہ حقوق پر اثر انداز ہونے والے قوانین عمومی طور پر مستقبل کی کارروائیوں پر نافذ العمل ہوتے ہیں، ماسوائے اس کے کہ خود قانون میں اس کے ماضی سے اطلاق کی وضاحت کی گئی ہو۔ دفعہ ۱۴[۳] کے حوالے سے عدالت نے بتایا کہ ۱۴ جولائی ۲۰۰۵ سے پہلے کے غیر ملکی تاشی ایوارڈز پر آرٹریژن ایکٹ ۲۰۱۱ لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

تمام تر دلائل کا جائزہ لینے کے بعد معزز عدالت نے دوسرے سوال کے جواب میں قرار دیا کہ مذکورہ ایوارڈز چونکہ آرٹریژن ایکٹ ۲۰۱۱ کے تحت فارن ایوارڈز کی تعریف پر پورا اترتا ہے لہذا اسے مذکورہ ایکٹ کے دفعہ ۱۰[۲] کے تحت اس ایکٹ کے دائرہ کار سے نہیں نکالا جاسکتا اسی لیے [اے ایم سی] کی جانب سے مذکورہ ایوارڈز کو آرٹریژن ایکٹ ۱۹۳۰ کے سیکشن ۳۰ اور ۳۳ کے تحت چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

یوں عدالت نے دونوں اپیلوں کا فیصلہ سناتے ہوئے لاہور ہائیکورٹ اور سول کورٹ لاہور کے فیصلوں کو منسوخ کر دیا اور سندھ ہائی کورٹ کے ڈیویژن بینچ کے فیصلے کو درست قرار دیا کہ مذکورہ کیس میں ”امر فیصل شدہ“ کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ عدالت یہ کہتے ہوئے [اے ایم سی] کی اپیل خارج کر دیتی ہے کہ ”ریس سب جوڈس³⁹“ بھی اس مقدمے میں لاگو نہیں ہوتا کیونکہ سندھ ہائی کورٹ کے سنگل بینچ کو [ٹیبی] کی درخواست کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا جا چکا تھا۔

³⁹ Res Sub Justice.

فوجداری مقدمات

سٹیجیٹری گراؤنڈ پر ضمانت کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک انتہائی اہم اور تاریخ ساز

فیصلہ 40

محمد ذوالقرنین⁴¹



کیس کے حقائق:

روحان احمد نامی ملزم کے خلاف ۲۶ مئی ۲۰۲۰ کو ایف آئی اے سائبر کرائم ونگ کی جانب سے مجموعہ تقریرات پاکستان کے دفعہ ۲۹۵-بی، ۲۹۸-سی، ۱۲۰-بی، ۱۹۰، ۳۳ اور پیکا ایکٹ کے دفعہ ۱۱ کے تحت اس وجہ سے ایف آئی آر کا اندراج کیا جاتا ہے کہ ملزم روحان پر یہ الزام ہوتا ہے کہ اس نے شکایت کنندہ کو نہ صرف موبائل ایس ایم ایس بلکہ واٹسپ پر بھی گستاخانہ مواد بھیجا بلکہ بعد میں ایف آئی اے کی جانب سے چھاپے کے دوران گستاخانہ مواد برآمد بھی ہوا۔ ایف آئی اے کی جانب سے ایف آئی آر کے اندراج کے بعد ملزم کو ۲۶ مئی ۲۰۲۰ کو ہی گرفتار کر دیا جاتا ہے جس کے خلاف ملزم عدالت سے رجوع کر کے درخواست ضمانت دائر کر دیتا ہے لیکن ملزم کی یہ درخواست عدالت کی جانب سے ۲۶ اگست ۲۰۲۱ کو خارج کر دیتی ہے جس کے بعد ملزم عدالت عالیہ لاہور سے نہ صرف میٹ پر بلکہ سٹیجیٹری گراؤنڈ پر بھی ضمانت کی استدعا کرتا ہے لیکن ۲۲ اگست ۲۰۲۳ کو ملزم کی یہ درخواست بھی خارج کر دی جاتی ہے۔ عدالت عالیہ

⁴⁰ یہ انتہائی اہم فیصلہ، سپریم کورٹ کے جج، جسٹس سید منصور علی شاہ صاحب نے لکھا ہے جس کو "کریمنل پیشیشن نمبر ۳۸۵-ایل آف ۲۰۲۳" کے طور پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

⁴¹ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ وٹریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

لاہور سے درخواست ضمانت خارج ہونے کے بعد ملزم کی جانب سے بدیں وجہ سپریم کورٹ میں لیو ٹو ایبل کی درخواست دائر کی جاتی ہے جس کو سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ بشمول جسٹس سید منصور علی شاہ صاحب، جسٹس جمال مندوخیل صاحب اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب کے سامنے مقرر کیا جاتا ہے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ:

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا آغاز اس نکتے سے کیا ہے کہ ملزم کو پولیس کی جانب ۲۶ مئی ۲۰۲۰ کو گرفتار کیا گیا لیکن شومی قسمت کہ ٹرائل کے دوران ملزم کی جانب سے ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۶۵-سی کے تحت ایک درخواست جمع کی جاتی ہے کہ مجھے وہ تمام کاغذات مہیا کئے جائیں جن کا زکر پولیس رپورٹ میں ہے لیکن ٹرائل کورٹ ملزم کی یہ درخواست خارج کر دیتی ہے جس کے بعد ملزم ٹرائل کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کرتا ہے جس پر عدالت عالیہ نے ۷ ستمبر ۲۰۲۱ کو درخواست پر فیصلے کی بجائے ملزم کے خلاف کارروائی کو عدالت عالیہ کے فیصلے تک ملتوی کرنے کا حکم دے دیتی ہے جس کے بعد اصل مسئلہ یہاں پر پیدا ہوا کہ ملزم کی اس درخواست پر ایک طرف عدالت عالیہ کی جانب سے سماعت نہیں ہو رہی تو دوسری طرف ملزم کے ٹرائل کی کارروائی بھی ملتوی ہے۔

سپریم کورٹ کی جانب سے مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے بعد ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۳۹۷ میں مذکور سٹیپنڈری گراؤنڈ پر آتی ہے جس کے تحت اگر کوئی ملزم کسی ایسے الزام میں قید ہو کہ جس کی سزا؛ سزائے موت ہو تو ایسی صورت میں اگر ملزم کے قید میں ۲ سال گزر جائیں اور اس کے خلاف ٹرائل کا اختتام نہ ہو اگر ٹرائل میں تاخیر ملزم کی جانب سے نہ ہوئی ہو تو ملزم کا یہ آئینی و قانونی حق ہے کہ ملزم کو فی الفور ضمانت پر رہا کیا جائے۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ملزم کو حاصل یہ حق صرف سٹیپنڈری نہیں بلکہ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۴، ۹، اور ۱۰-اے کے تحت یہ ملزم کا بنیادی آئینی حق ہے۔

مندرجہ بالا نکات کی صراحت کے ساتھ وضاحت کے بعد جسٹس منصور علی شاہ صاحب نے ایک بحث اس موضوع پر باندھی ہے کہ وہ کونسے ایسے عوامل ہیں جن کی موجودگی میں ملزم کو سٹیپنڈری گراؤنڈ دستیاب نہیں ہوگا تو اس بابت سپریم کورٹ نے لکھا ہے کہ ملزم کے خلاف یہ ثابت کیا

جائے گا کہ اس نے قصداً ٹرائل کو موخر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے یہ واضح کیا جائے گا کہ ملزم نے مسلسل ٹرائل کے اہم مواقع یعنی جرح وغیرہ کے وقت ٹرائل کو ملتوی کرنے کی درخواستیں دی ہیں۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے ایک انتہائی اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ صرف درخواستوں کو شمار کرنے سے کام نہیں ہوگا کہ کس نے زیادہ درخواستیں ٹرائل کو موخر کرنے کے لئے دی ہیں اور چونکہ اس کیس میں تاخیر عدالت عالیہ کی جانب سے ہوئی ہے کیونکہ عدالت عالیہ نے ۳ سال گزرنے کے بعد بھی ملزم کی جانب سے پیش کی جانے والی درخواست پر فیصلہ نہیں دیا۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے عدالت عالیہ کے پاس کمیگز کو ملتوی یعنی سٹے دینے کے اختیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر ایک طرف عدالت کے پاس یہ اختیار ہے تو اس اختیار کا استعمال نہایت احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے اور ایک دفعہ یہ اختیار استعمال کیا جائے تو پھر درخواست پر جلد از جلد فیصلہ دینا چاہیے۔

سپریم کورٹ نے مندرجہ بالا امور واضح کرنے کے بعد ملزم کو ایک لاکھ روپے کے ضمانتی چیکوں کے عوض ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کیس کو نہ صرف رپورٹ کرنے کی منظوری دی بلکہ عدالت عالیہ لاہور کے ذریعے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے سامنے رکھنے کا بھی حکم دیا تاکہ آئندہ ایسے امور میں بہتری آئے۔

کیس کا خلاصہ:

فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ چار سو ستاونے کے تحت ملزم کو حاصل سٹیچوٹری گراؤنڈ کے اس حق کو آئین پاکستان کے آرٹیکل چار، نو اور دس اے کے تناظر میں دیکھا جائے گا اور بدیں وجہ ملزم کو اس حق کے حصول سے صرف اس وجہ سے محروم نہیں کیا جائے گا کہ ملتوی کرنے کی درخواستوں کو شمار کیا جائے بلکہ ملزم کو اس حق سے محروم کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ملزم کے خلاف یہ ثبوت ہوں کہ اس نے قصداً مسلسل کوششوں کے ذریعے ٹرائل کے اہم تاریخوں پر کیس کو موخر کیا ہے۔

قادیانی شہری کو سپریم کورٹ کی جانب سے ضمانت دینے کے معاملہ پر سپریم کورٹ کا اہم

فیصلہ 42

محمد ذوالقرنین⁴³



کیس کے حقائق:

مہارک احمد ثانی نامی ایک ملزم کے خلاف ضلع چنیوٹ کے مقامی تھانے میں مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۹۵-بی، ۲۹۸-سی اور پنجاب کے اشاعت قرآن ایکٹ کے دفعہ ۷ اور ۹ کے تحت ۶ دسمبر ۲۰۲۲ کو اس وجہ سے ایف آئی آر درج کرائی جاتی ہے کہ ملزم پر یہ الزام تھا کہ وہ قادیانی مذہب کی مشہور تفسیر "تفسیر صغیر" کی تقسیم میں ملوث ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ملزم پر بنیادی طور پر ۳ الزامات تھے جو کہ ذیل ہیں:

1. پنجاب قرآن [پرنٹنگ اینڈ ریکارڈنگ] ایکٹ ۲۰۱۱ کے دفعہ ۷ اور ۹ کے تحت تفسیر صغیر کی تقسیم کا الزام۔

2. مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۹۵-بی کے تحت توہین قرآن کا الزام۔

3. مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۹۸-سی کے تحت قادیانی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کا خود کو مسلمان ظاہر کرنے کا الزام۔

مندرجہ بالا الزامات کے تحت ۶ دسمبر ۲۰۲۲ کو ایف آئی آر کے اندراج کے بعد بالآخر ملزم کو ۷ جنوری ۲۰۲۳ کو گرفتار کر دیا جاتا ہے جس کے بعد بالترتیب ۱۰ جون اور ۲۷ نومبر کو ایڈیشنل

⁴² سپریم کورٹ کا یہ اہم فیصلہ چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے لکھا ہے اور ان کے ساتھ جسٹس مسرت ہلالی نے اتفاق کیا ہے اور اس فیصلہ کو "کریمنل پیشینہ نمبر ۱۹۵۳-ایل آف ۲۰۲۳" کے طور پر سپریم کورٹ کی ویب سائٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

⁴³ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

سیشن جج اور لاہور ہائی کورٹ سے ملزم کی ضمانت خارج کردی جاتی ہے جس کے بعد اس کیس کی ابتدا سپریم کورٹ میں ہوتی ہے اور سپریم کورٹ میں یہ کیس چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب اور جسٹس مسرت ہلالی صاحبہ پر مشتمل دو رکنی بینچ کے سامنے مقرر ہوتا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1. نوٹ: یاد رہے کہ سپریم کورٹ کے سامنے اس کیس میں دو سوالات تھے جن میں پہلا تو ملزم کی جانب سے ضمانت بعد از گرفتاری کی درخواست تھی اور دوسرا معاملہ ملزم پر جو فرد جرم عائد کیا گیا تھا تو اس فرد جرم سے مختلف جرائم کو حذف کرنے کی درخواست تھی۔

وکلاء کے دلائل:

ملزم کے وکیل نے پہلا نکتہ یہ اٹھایا کہ ملزم کے خلاف ۶ دسمبر ۲۰۲۲ کو جو ایف آئی آر کاٹی گئی ہے تو اس کے مطابق ملزم نے پر الزام یہ ہے کہ اس نے ۲۰۱۹ میں تفسیر صغیر تقسیم کیا ہے جو کہ پنجاب کے اشاعت قرآن قانون کے تحت جرم ہے لیکن یاد رہے کہ ایسی کوئی تفسیر تقسیم کرنے پر پابندی ۲۰۲۱ میں لگی ہے یعنی اگر ۲۰۲۱ کے بعد اگر کوئی ایسی تفسیر تقسیم کرے گا تو وہ پنجاب اشاعت قرآن قانون کے تحت جرم کے ضمنے میں آئے گا تو یہاں پر دو مسئلے آئے۔ پہلا تو یہ کہ ملزم پر الزام یہ تھا کہ اس نے تفسیر صغیر ۲۰۱۹ میں تقسیم کی ہے تو تب یہ پنجاب اشاعت قرآن قانون کے تحت جرم نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ فوجداری مقدمات میں مقدمہ بروقت دائر کرنا بہت زیادہ اہمیت کا متقاضی ہوتا ہے لیکن اس کیس میں ۲۰۱۹ کے الزام کی بابت ایف آئی آر سال ۲۰۲۲ کے آخر میں درج کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس حوالے سے آئین پاکستان کا آرٹیکل ۱۰ نہایت ہی واضح ہے جو کہ صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ کسی کو بھی کسی ایسے کام کرنے کی سزا نہیں دی جا سکتی، جب تک وہ اس کے کرتے وقت کسی قانون کے تحت جرم کی تعریف میں نہ ہو تو اس لئے چونکہ تفسیر صغیر ۲۰۱۹ میں تقسیم کرنا جرم نہیں تھا تو اس لئے پنجاب اشاعت قرآن قانون کے تحت ملزم کے خلاف فرد جرم نہیں عائد کیا جا سکتا تھا۔

تفسیر صغیر کی تقسیم کا معاملہ واضح کرنے کے بعد سپریم کورٹ نے بقیہ دو الزامات یعنی توہین قرآن اور خود کو مسلمان ظاہر کرنا تو اس حوالے سے ملزم کے خلاف نہ تو ایف آئی آر اور نہ ہی پولیس کے چالان میں مندرجہ بالا الزامات کے بابت کوئی بات ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ملزم نے ایسا کوئی جرم انجام دیا ہو تو اس وجہ عدالت نے مندرجہ بالا دونوں دفعات فرد جرم سے حذف کرنے کا فیصلہ کیا۔

سپریم کورٹ کے سامنے چونکہ دو سوالات تھے تو پہلا معاملہ واضح کرنے کے بعد فیصلے میں قرآن مجید کے مندرجہ ذیل آیات کا حوالہ دیا گیا ہے :

1. سورة البقرة کی آیت نمبر ۲۵۶۔

2. سورة الرعد کی آیت نمبر ۴۰۔

3. سورة یونس کی آیت نمبر ۹۹۔

قرآن مجید کے مختلف آیات کا حوالہ دینے کے بعد سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں آئین پاکستان میں مذکور آزادی مذہب کا ذکر کیا ہے۔

سپریم کورٹ نے اس کے بعد ملزم کی جانب سے ضمانت بعد از گرفتاری والے قضیے کا رخ کیا ہے جس کا آغاز سپریم کورٹ نے کچھ یوں کیا ہے کہ ملزم پر فرد جرم تو فوجداری قانون ترمیمی ایکٹ ۱۹۳۲ کے دفعہ ۵ کے تحت تو عائد نہیں کی گئی لیکن ایف آئی آر اور چالان کے مندرجات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملزم نے یہ مندرجہ بالا دفعہ کے تحت جرم کیا ہے جس کے تحت زیادہ سے زیادہ سزا ۶ مہینے ہے اور ملزم نے پہلے سے ہی تقریباً ۱۳ ماہ سے جیل میں ہے تو اس لئے عدالت نے فی الفور ملزم کو ۵ ہزار کے ضمانتی چکلکوں کے عوض ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا۔ سپریم کورٹ نے فیصلے کے آخر میں نہایت ہی اہم بات لکھی ہے کہ اس طرح کے کیسز کا بنیادی تعلق کسی عام آدمی یا اس کی پراپرٹی کے ساتھ نہیں بلکہ ریاست کے ساتھ ہے۔

خلاصہ:

اس انتہائی اہم کیس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ جب ایک الزام اس کے کرنے کے وقت کسی قانون کے تحت جرم نہیں ہو تو اس کے کرنے والے کو اس کام کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

ملزم کو پولیس ریمانڈ میں بھیجنے سے متعلق لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ⁴⁴

افراسیاب خان⁴⁵



کیس کے حقائق:

غلام سرور اور اللہ بخش نامی دو افراد کے خلاف تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۰۲ اور ۳۴ کے تحت مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ مقدمہ کے مطابق انہوں نے نازو نامی شخص اور محترمہ سرداراں مائی [غلام سرور کی بیوی] کو قتل کیا۔ جس کی وجہ سے انہیں حراست میں لیا جاتا ہے اور مختلف مواقع پر پولیس کی جانب سے ٹچلی عدالت کو ریمانڈ کی درخواست کیے جانے کی بنا پر انہیں وقتاً فوقتاً ریمانڈ پر بھیجا جاتا ہے۔ جس کی صورت میں وہ ٹچلی عدالت سے ضمانت پر رہائی کی درخواست کرتے ہیں لیکن ان کی یہ درخواست مسترد ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد درخواست گزار غلام سرور اور اللہ بخش لاہور ہائی کورٹ سے ضمانت کی درخواست کرتے ہیں۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوالات:

اس کیس کی سماعت جسٹس محمد منیر خان کی عدالت میں ہوتی ہے۔ جس کے فیصلے میں ۲ بنیادی نقطے واضح ہوتے ہیں۔

1. عدالت ضمانت کے متعلق اس کیس کا فیصلہ سنا دیتی ہے۔
2. عدالت ریمانڈ کے متعلق اٹھارہ اصول مرتب کرتی ہے، جو بعد میں ہائی کورٹ رولز کا حصہ بھی بن جاتے ہیں۔

وکلاء کے دلائل:

⁴⁴ یہ فیصلہ جناب جسٹس محمد منیر خان صاحب نے میں تحریر کیا تھا اور کیس حوالہ "۱۹۸۳" پی سی آر ایل جے ۲۵۸۸ کے تحت عدالتی ریکارڈ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

⁴⁵ ایڈووکیٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

استغاثہ [پراسیکیوشن] کے بیانات:

سماعت کے دوران استغاثہ کے بیانیے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک رات کو درخواست گزاروں نے نازو پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا اور پھر زبردستی غلام سرور کے گھر لے گئے۔ وہاں، انہوں نے مبینہ طور پر نہ صرف نازو کو قتل کیا بلکہ محترمہ سرداراں مائی [غلام سرور کی بیوی] کو بھی قتل کیا۔ استغاثہ کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں شک تھا کہ ان کے آپس میں غیر ازدواجی تعلقات ہیں۔

درخواست گزاروں کی طرف سے دلائل:

اس کیس کے دوران غلام سرور اور اللہ بخش کے وکیل دفاع نے ابتدائی معلوماتی رپورٹ [ایف آئی آر] درج کرنے میں ۲۴ گھنٹے کی تاخیر پر روشنی ڈالی، اور واقعات کی مزید نفاست سے تشریح کی تجویز پیش کی گئی، اور استغاثہ کی جانب سے پہلے سے طے شدہ جرم کی تصویر کشی کو چیلنج کیا گیا۔ وکیل کی جانب سے "grave & sudden provocation" کا تصور بھی پیش کیا گیا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کسی جذباتی لمحے کے لیے متاثر کن رد عمل تھا۔ آخر میں، وکیل صاحب نے مجسٹریٹ کی جانب سے درخواست گزاروں کو بار بار ریمانڈ پر بھیجے جانے پر سخت اعتراض کیا، اور عدالت کے سامنے یہ پہلو رکھا کہ بغیر کسی مناسب جواز کے بار بار ریمانڈ پر بھیجنا ایک غیر قانونی حراست کے مترادف ہے۔

عدالتی کارروائی اور فیصلہ:

عدالت کی جانب سے دونوں فریقین کے دلائل غور سے سنے گئے۔ شواہد کا جائزہ لیتے ہوئے عدالت نے اس بات پر غور کیا کہ نازو پر ابتدائی طور پر ایک مختلف جگہ پر حملہ کیا گیا اور پھر زخمی حالت میں غلام سرور کے گھر زبردستی لے جایا گیا۔ جس کی وجہ سے عدالت grave and sudden provocation کی درخواست کو قبل از وقت قرار دیا۔

جس کے بعد، عدالت پولیس رپورٹ میں الزامات، گواہوں کے بیانات اور طبی ثبوت کی بنیاد پر ضمانت کی درخواست کا جائزہ لیتی ہے۔ عدالت کے مطابق، موجودہ شواہد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نازو کو آٹھ زخم آئے تھے، اور پہلے دو تیز دھار ہتھیار سے تھے، جو اس کی موت کا

سبب بنے۔ جبکہ سرداراں مائی کو چار زخم آئے تھے، اور پہلا زخم تیز دھار ہتھیار سے مہلک تھا۔ دیگر زخم صرف خروچ تھے جو اس کی موت کا سبب نہیں بنے۔

اسی دوران عدالت نے یہ بھی نشاندہی کی کہ غلام سرور کے گھر میں کسی نے اللہ بخش کو نازو اور سرداراں مائی کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہاں، رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ ایک لاٹھی پائی گئی تھی، جو عموماً کسی کی موت کا سبب نہیں بنتی۔ لیکن غلام سرور کے خلاف قتل سے متعلق جتنے بھی ثبوت ملے تھے وہ اس کے خلاف کافی تھے۔ چنانچہ عدالت، اللہ بخش کو کچھ شرائط کے ساتھ ضمانت کی اجازت دے دیتی ہے جبکہ غلام سرور کی درخواست کو خارج کر دیتی ہے۔

اس کیس کے دوران، مجسٹریٹ کی جانب سے ملزمان کو پولیس کی درخواست پر ریمانڈ پر بھیجے پر عدالت نے برہمی کا اظہار کیا۔ عدالت نے یہ بھی نوٹ کیا کہ یہ ریمانڈ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۷ اور ۳۴۴ کے مطابق ریمانڈ کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے بعد، جسٹس منیر خان نے ریمانڈ کے متعلق مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے:

1. پہلے ۱۵ دنوں کے دوران، مجسٹریٹ آزادانہ طور پر عدالتی تحویل میں ملزم کو ریمانڈ میں رکھنے کا اختیار دے سکتا ہے لیکن ملزم کو پولیس کی تحویل میں ریمانڈ میں رکھنے کی اجازت نہیں دے گا سوائے ایک مضبوط اور غیر معمولی بنیادوں کے ہوتے ہوئے اور وہ بھی کم سے کم مدت کے لیے۔
2. مجسٹریٹ ریمانڈ دینے کی وجوہات ریکارڈ کریگا۔
3. جب کوئی مجسٹریٹ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۷ کے تحت کوئی حکم دیتا ہے، تو انہیں اس حکم کی ایک نقل سیشن جج کو بھیجینی ہوگی۔ یاد رہے کہ دفعہ ۱۶۷ پولیس ریمانڈ کے متعلق ہے، جس کے مطابق اگر پولیس کی تفتیش ۲۴ گھنٹوں میں مکمل نہیں ہوتی تو پولیس مجسٹریٹ کی اجازت سے ملزم کو مزید تفتیش کے لئے تحویل میں رکھ سکتا ہے، لیکن اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔
4. ۱۵ دن گزر جانے کے بعد، مجسٹریٹ پولیس سے کیس کے متعلق تمام ضروری دستاویزات فراہم کرنے کو کہے گا، جسے "چالان" کہا جاتا ہے۔ اگر پولیس نے مقرر

- وقت تک یہ معلومات جمع نہیں کیں تو جج ملزم کو مزید قید میں رکھنے کی اجازت نہیں دے گا۔ بلکہ، مجسٹریٹ انہیں ضمانت پر رہا کر دے گا۔
5. ۱۵ دن گزر جانے کے بعد، عدالت کسی شخص کی ریمانڈ میں توسیع نہیں کرے گی جب تک کہ پولیس ریمانڈ یا التوا کی درخواست جمع کر کے توسیع کی باضابطہ درخواست نہ کرے۔
6. اگر پراسیکیوشن یا پولیس ملزم کی گرفتاری کے ۱۵ دن بعد درخواست دیتی ہے، تو اسے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۳ کے تحت کارروائی میں تاخیر یا ملتوی کرنے کی درخواست سمجھا جائے گا۔
7. کسی کو ریمانڈ میں رکھنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے، مجسٹریٹ کو یہ یقین دہانی ہونی چاہیے کہ پولیس نے معقول شبہ پیدا کرنے کے لیے کافی شواہد اکٹھے کیے ہیں کہ ملزم نے جرم کیا ہے۔ اور، مجسٹریٹ کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ ریمانڈ منظور ہونے کے بعد ملزم کو ریمانڈ میں رکھنے کے دوران مزید شواہد اکٹھے ہو سکتے ہیں۔
8. ملزم کی غیر موجودگی کی صورت میں مجسٹریٹ ملزم کو ریمانڈ میں رکھنے یا التوا کا فیصلہ نہیں کرے گا۔
9. مجسٹریٹ کو اپنے گھر پر کسی کو ریمانڈ پر بھیجنا یا التوا جیسی قانونی کارروائیوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ یعنی ایسی کارروائیاں عدالتی حدود میں ہونی چاہئیں۔
10. مجسٹریٹ ملزم کو قانونی ریمانڈ میں تاخیر یا توسیع کے فیصلے کے بارے میں کسی بھی قسم کے خدشات یا اعتراضات کو بولنے اور اظہار کرنے کا موقع دے گا۔ یعنی ملزم کو اپنی رائے کا اظہار کرنے اور التوا یا ریمانڈ سے متعلق کوئی مسئلہ اٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔
11. اگر کسی ملزم کی طرف سے کوئی اعتراض اٹھایا جاتا ہے تو مجسٹریٹ پر لازم ہے کہ وہ اس کے اعتراضات ریکارڈ کرے اور اسے مسترد کرنے کی وجوہات بیان کریں۔
12. مجسٹریٹ پر لازم ہے کہ ریمانڈ جاری کرنے سے پہلے وہ پولیس فائل کا مکمل معائنہ کرے۔

13. اگر ریمانڈ کی اجازت حاصل کرنے کے بعد بھی پولیس کی جانب سے کوئی مناسب تفتیش نہیں ہوئی، تو مجسٹریٹ مزید ریمانڈ یا التوا سے انکار کر گا۔

14. مجسٹریٹ ملزم کو ریمانڈ میں رکھنے یا ملتوی کرنے میں مزید توسیع یا تاخیر کی اجازت نہیں دے گا، اگر اس شخص کی گرفتاری کے بعد دو ماہ گزر چکے ہوں۔ اس نام فریم کو معقول سمجھا جاتا ہے یعنی کہ مجسٹریٹ صرف اس صورت میں توسیع کی اجازت دے گا جب کوئی مجبوری ہو یا ضرورت ہو۔ یہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ قانونی کارروائی بروقت آگے بڑھے اور افراد کو ایک طویل مدت کے لیے مناسب جواز کے بغیر حراست میں نہ رکھا جائے۔

15. اگر پولیس دستاویزات کا مکمل سیٹ جمع کرانے میں ناکام رہتی ہے، جسے "چالان" کہا جاتا ہے، تو اس صورت میں مجسٹریٹ دستیاب نامکمل چالان کی بنیاد پر مقدمے کی ساعت شروع کرے گا اور فراہم کردہ گواہوں کی فہرست میں درج گواہوں کی جانچ کرے گا۔

16. اگر پولیس کی طرف سے چالان دو ماہ کے اندر جمع نہیں کیا جاتا ہے، تو مجسٹریٹ ضلع کے سیشن جج کو معاملے کی رپورٹ کرے گا اور پولیس کی ناقص کارکردگی کو ضلع کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس [ایس پی] کے نوٹس میں بھی لائے گا۔

17. مجسٹریٹ کسی ملزم کی ریمانڈ کی اجازت صرف اس وجہ سے نہیں دے گا کہ وہ استغاثہ یا پولیس کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ بلکہ ریمانڈ دینا ایک عدالتی اختیار ہے جو مناسب غور کے بعد دیا جاتا ہے۔

18. مجسٹریٹ کسی کو ریمانڈ دینے یا التوا کرتے وقت ہمیشہ وضاحت یا وجوہات فراہم کرے گا۔

یہ نکات بیان کرنے کے بعد فاضل جج نے اس آرڈر کی کاپی پنجاب کے تمام اضلاع کے ضلع مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس [ایس پی] اور سیشن جج کو ارسال کر دی۔

پولیس کا ایک سے زائد کیسز میں ملزم کو بار بار جسمانی ریمانڈ پر حراست میں لینے کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ⁴⁶

حمزہ خان⁴⁷



کیس کے حقائق:

پولیس ایف آئی آر نمبر ۳۸۷۳۳-۲۰۲۳ میں ملزم ظہیر الحسن کو تھانہ غازی آباد ضلع لاہور میں گرفتار کرتی ہے اور متعلقہ مجسٹریٹ سے ملزم کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرتی ہے۔ مجسٹریٹ صاحب بمورخہ ۲۹ دسمبر ۲۰۲۳ ملزم کو جیل حوالات میں بند کرنے کا حکم صادر کرتا ہے۔ پولیس ملزم کو حسب الحکم جیل حوالات میں بند کرنے کے بجائے ایک دیگر ایف آئی آر نمبر ۱۶۴۱-۲۰۲۳ میں ملزم کو تھانہ انارکلی ضلع لاہور میں جسمانی ریمانڈ پر بند کرتی ہے۔

دوسری طرف پولیس مؤقف اپناتی ہے کہ انھوں نے ملزم کو حسب الحکم جیوڈیشل حوالات میں بند کیا تھا، تاہم بعد ازاں مجسٹریٹ کے حکم سے پولیس نے دوسرے ایف آئی آر میں دوسرے تھانے میں ملزم کو زیر حراست رکھا ہے۔ اس پر وکیل درخواست گزار اعتراض اٹھاتا ہے کہ جب ایک دفعہ جیل حوالات میں بند ہوا تو اس مقدمے میں یا کسی دیگر مقدمے میں ملزم کو دوبارہ جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے نہیں کیا جاسکتا، البتہ پولیس جیل کے حدود میں ملزم سے تفتیش کر سکتی ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال :

⁴⁶ یہ انتہائی اہم فیصلہ جناب محمد امجد رفیق، جج لاہور ہائی کورٹ کا تحریر کردہ ہے جو کہ آئینی درخواست نمبر

۱۰۷۵ آف ۲۰۲۳ یا پی ایل بے ۲۰۲۳ لاہور صفحہ ۴۰۴ کے حوالے کے ذریعے دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

⁴⁷ ایڈووکیٹ ڈسٹرکٹ کورٹس تیمرگرہ وٹیم ممبر آئین و قانون۔

جب کسی ملزم پر ایک سے زائد ایف آئی آرز درج ہو تو کیا پولیس کسی ایک مقدمے میں ملزم کے جسمانی ریمانڈ ختم ہونے یا اس کی ضمانت پر رہائی کے بعد دوسرے مقدمے میں ملزم کو تفتیش کے لئے گرفتار کر سکتی ہے؟

عدالت میں دلائل اور بحث:

مذکورہ بالا اعتراض پر عدالت ضابطہ فوجداری کی طرف بالعموم اور متعلقہ دفعات ۱۶۷ اور ۳۴۴ ض ف کی طرف بالخصوص رجوع کر کے ذیل بحث کرتی ہے:

عدالت دفعہ ۱۶۷ اور ۳۴۴ ضابطہ فوجداری کا جائزہ لیتے ہوئے بحث کرتی ہے کہ اگر ملزم پہلے سے کسی کیس میں بند بر چیوڈیشنل حوالات ہو چکا ہے تو مذکورہ بالا دفعات سمیت ضابطہ فوجداری میں کہیں بھی دوسرے ایف آئی آر میں پولیس کا ملزم کو جسمانی ریمانڈ پر زیر حراست لینے کا اختیار مذکور نہیں ہے۔ تاہم اس عمل کی صریح نفی بھی موجود نہیں ہے۔ لہذا اس مسئلے پر عدالت کی معاونت کے لئے فاضل پراسیکیوٹر جنرل، پنجاب اور فاضل اسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کو بلایا جاتا ہے۔

پراسیکیوٹر جنرل پنجاب نے موقف اپنایا کہ پولیس کا اپنی من مرضی سے مختلف ایف آئی آرز میں بار بار ملزم کو تفتیش کے بہانے جسمانی ریمانڈ پر زیر حراست لینے کا عمل بنیادی حقوق اور آزادی کی نفی کرتا ہے۔ اسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل نے تائید کرتے ہوئے اضافہ کیا کہ جہاں مناسب ہو وہاں مختلف ایف آئی آرز میں ملزم کو جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ڈپٹی پراسیکیوٹر جنرل نے اضافہ کیا کہ مختلف ایف آئی آرز میں ملزم کے جسمانی ریمانڈ کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے طریقہ کار وضع کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

عدالتی نظائر کا تجزیہ:

اب یہ بات مسلمہ اصول کے طور پر سامنے آتی ہے کہ جب ایک دفعہ ملزم کو کسی کیس میں جیل حوالات میں بند کیا جاتا ہے تو بعدہ اسے دوبارہ پولیس کی حراست میں نہیں دیا جا سکتا، تاہم غیر معمولی حالات میں ملزم کو دوبارہ بھی پولیس کی حراست میں دیا جا سکتا ہے اگر پولیس اپنے درخواست میں جسمانی ریمانڈ کی ضرورت کے حوالے سے عدالت کو مطمئن کریں اور عدالت وجوہات کو فیصلے کا حصہ بنائے۔

مسلمہ اصول سے استثناء:

اس کے برعکس اگر ملزم پر ایک سے زائد ایف آئی آرز مختلف تھانوں، ضلعوں یا صوبوں میں درج ہو اور ملزم کسی بھی ایک ایف آئی آر میں بند بر چیوڈیشنل حوالات ہو تو ایسی صورت میں جسمانی ریمانڈ دینا چاہیے، تاہم تمام تر ضروری لوازمات پورے کرنے اور ٹرائل عدالت سے اجازت لینے کے بعد۔ ضابطہ نوجداری کا دفعہ ۱۶۷ اور ۳۴۴ ہرگز یہ قدغن نہیں لگاتا کہ ملزم کو پولیس کی حراست میں نہیں دیا جا سکتا اگر پولیس کو واقعاً ملزم دوسرے کیس میں تفتیش کے لئے درکار ہو۔

پولیس کا ملزم کو ایک ہی صوبے کے ایک کیس میں رہائی کے بعد دوسرے کیس میں گرفتار کرنا:
عدالت عالیہ نے "مسماة رضیہ پرویز بنام ایس ایس پی ملتان، پرویز الہی بنام نگران حکومت پنجاب اور اسد قیصر بنام حکومت خیبر پختونخوا" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جب ملزم کو کسی کیس میں گرفتار کیا جائے تو وہ ماقبل درج شدہ تمام کیسز میں گرفتار تصور کیا جائے گا۔ ملزم کو ایک ہی صوبے کے کسی ایک کیس میں ضمانت پر رہائی کے بعد دوسرے کیسز میں گرفتار کرنا اختیارات کے ناجائز استعمال کے زمرے میں آتا ہے۔ تاہم مختلف تھانوں، ضلعوں اور صوبوں میں درج کیسز کی صورت میں اگر ملزم پہلے سے جیل حوالات میں بند ہو تو اسے دوبارہ جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے اگر پولیس عدالت کو دوسرے کیس میں تفتیش کی ضرورت کے حوالے سے مطمئن کریں۔

عدالت کا فیصلہ:

اگرچہ موجودہ کیس میں ملزم پر ایک سے زائد کیسز مختلف تھانوں میں درج شدہ ہیں اور عدالت کا دوسرے کیسز میں جسمانی ریمانڈ دینا خلاف قانون نہیں ہو سکتا، تاہم وکیل درخواست گزار نے موقف اپنایا کہ پولیس نے مجسٹریٹ صاحب کے حکم مصدرہ ۲۹ دسمبر ۲۰۲۳ سے روگردانی کرتے ہوئے ملزم کو جیل حوالات میں بند نہیں کیا تھا۔ رپورٹ کمیٹیٹل سٹی پولیس اسلام آباد اس بات کی تائید کرتا ہے۔ لہذا عدالت متعلقہ پولیس اہلکاران کو اپنی ڈیوٹی سے غفلت مجرمانہ کے مرتکب قرار دیتی ہے۔ نتیجتاً مذکورین پر زیر دفعہ ۱۵۵ ایف آئی آر نمبر درج کیا جاتا ہے اور ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جاتا ہے۔

خلاصہ :

اگر ملزم پر ایک سے زائد کیسیز درج ہو اور ملزم کسی ایک کیس میں جیل حوالات میں بند ہو چکا ہو تو تمام رجسٹرڈ شدہ کیسیز میں اسے گرفتار تصور کیا جائے گا اور عدالت ملزم کو دوبارہ پولیس کے حراست میں نہیں دے گی۔ تاہم غیر معمولی حالات میں عدالت وجوہات ریکارڈ کرنے کے بعد ملزم کو ایک بار پھر جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر سکتی ہے۔

اسی طرح اگر ملزم پر مختلف تھانوں، ضلعوں یا صوبوں میں ایف آئی آر درج ہو اور ملزم کسی ایک ایف آئی آر میں جیل حوالات میں بند ہو چکا ہو تو پولیس متعلقہ مجسٹریٹ سے اجازت حاصل کرنے اور تمام ضروری لوازمات پورے کرنے کے بعد ملزم کو دوبارہ حراست میں لے سکتی ہے۔

ایف آئی آر کے اندراج کے حوالے سے جسٹس آف پیس اور پولیس کے اختیارات/حدود و قیود اور
جھوٹے مقدمات کی روک تھام کا صحیح راستہ کیا ہے، سپریم کورٹ کے معزز جج، جناب جسٹس محمد علی مظہر

صاحب کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ⁴⁸

طاہر خان وزیر⁴⁹



بنیادی سوال:

کیا جسٹس آف پیس پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دیتے ہوئے کیس کے جزئیات (میرٹس) کو زیر بحث لا سکتا ہے/یعنی کیا اضافی ہدایات دے سکتا ہے؟

کیس کے حقائق:

⁴⁸ اس بیچ میں جسٹس محمد علی مظہر (مصنف جج) اور جسٹس عرفان سعادت خان شامل ہے۔ اس فیصلے کو "سید قمر علی شاہ بنام حکومت سندھ وغیرہ" یا کریمینل پیٹیشن نمبر ۹۹-۹۹ کے آف ۲۰۱۸ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁴⁹ ایڈووکیٹ، اسلام آباد بار ایسو سییشن۔

درخواست گزار کا بھائی اغواء ہوتا ہے جس کی اغواء کاری میں مبینہ طور پر متعلقہ ایس ایچ او بھی شامل ہوتا ہے۔ درخواست گزار ایف آئی آر درج کرانے کے لیے ایس ایس پی کے پاس جاتا ہے جہاں سے ناکامی کے بعد جسٹس آف پیس کی عدالت میں درخواست زبردفعہ ۲۲-اے [ض] [ف] دائر کرتا ہے۔ جسٹس آف پیس درخواست مذکورہ کو منظور کر کے ایس ایچ او کو کچھ ہدایات دیتے ہیں [یہ ہدایات سپریم کورٹ فیصلہ میں تفصیل سے زیر بحث آئی ہیں، اس لیے ان سب کا ذکر کرنا لازم ہے]۔

1. درخواست گزار کا بیان ریکارڈ کیا جائے۔
2. اگر قابل دست اندازی جرم بنتا ہے تو ایف آئی آر درج کی جائے تاہم بغیر ٹھوس شواہد کے ملزم کو گرفتار نہ کیا جائے۔
3. اگر ایف آئی آر جھوٹی ثابت ہوتی ہے تو پولیس درخواست گزار کے خلاف دفعہ ۱۲۰ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت کارروائی کر سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ جسٹس آف پیس کا حکم مذکور نافذ ہو کر ملزمان پر ایف آئی آر درج کیا جاتا ہے، ملزمان کے حق میں ہائی کورٹ کا فیصلہ آتا ہے، جسٹس آف پیس کا حکم مذکور کا عدم قرار دیا جاتا ہے اور ہائی کورٹ درخواست گزار کو پرائیویٹ کمپلینٹ [استغاثہ] دائر کرنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کیونکہ سپریم کورٹ نے اس پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

سپریم کورٹ کا استدلال:

معزز عدالت نے پہلے جسٹس آف پیس کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے قرار دیا کہ [۲۲-اے ض ف] کے تحت جسٹس آف پیس کا اختیار نہ تو کیس کی جزئیات (میرٹس) کو زیر بحث لانا ہے اور نہ ہی تفتیشی ایجنسی کا کردار ادا کرنا ہے، بلکہ صرف اس بات کا تعین کرنا ہے کہ قابل دست اندازی جرم کا ارتکاب ہوا ہے کہ نہیں۔ اگر ہوا ہے تو دفعہ ۱۵۳ ضابطہ فوجداری کے تحت پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دینا ہے۔ یعنی جسٹس آف پیس کا کام صرف اور صرف پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دینا ہے اگر پولیس قابل دست اندازی جرم سرزد ہونے کے باوجود ایف آئی آر درج کرنے سے انکاری رہے۔

پولیس کے اختیارات:

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ پولیس کے سامنے جب بھی کسی جرم کے ارتکاب کی اطلاع پہنچائی جاتی ہے تو ان کا کام صرف اس بات کا تعین کرنا ہے کہ کیا مبینہ جرم قابل دست اندازی ہے یا نہیں۔ پولیس کسی جرم کی اطلاع کو درج

کئے بغیر اس کی صحت معلوم کرنے کے لیے انکو آری کرنا شروع کریں، یہ کہیں بھی قانون میں مذکور نہیں۔ ایف آئی آر پرائیویٹ کمپلیٹ؟

چونکہ ہائی کورٹ نے درخواست گزار کو پرائیویٹ کمپلیٹ درج کرنے کا کہا تھا، اس لئے سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اگر ہر کیس میں یہ طرز عمل اپنایا جائے تو ایف آئی آر کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا اور ہر کیس میں پرائیویٹ کمپلیٹ کا کہہ کر ایف آئی آر درج نہ کرنا پولیس کی ریت اور روایت بن جائے گی۔

پس عدالت قرار دیتی ہے کہ قانون پولیس کو پابند کرتا ہے کہ وہ جرم سرزد ہونے کی اطلاع پا کر فوراً ایف آئی آر درج کریں، پھر تفتیش کا آغاز کریں جو عمل فوجداری نظام انصاف میں بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔

عدالت نے قرار دیا کہ ہائی کورٹ کے چند نکات ایسے ہیں جو کہ براہ راست کیس کی جزئیات یعنی میرٹس تک جاتی ہیں۔ ہائیکورٹ کا کسی کیس کو جھوٹا کہنا یا تفتیشی کارکردار اختیار کرنا دفعہ ۵۶۱-۱ سے ضابطہ فوجداری کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ دفعہ مذکورہ کے تحت عدالت کے پاس یہ اختیار نہیں کہ مفروضوں پر مبنی نتائج یا فائنڈنگز دے کر قانون ضابطہ کو مفلوج کریں۔

عدالت کا فیصلہ:

معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ جھوٹے مقدمات کی روک تھام یقینی بنانے کے لئے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار حل نہیں ہے، بلکہ جھوٹے ممبر/اطلاع کنندہ کو دفعہ ۱۸۲ مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت سزا دینا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دیتے ہوئے درخواست گزار کی درخواست منظور کر لی۔

دماغی طور پر عدم توازن کے شکار شخص پر گستاخی رسول کے الزام کی صورت میں ضمانت سے متعلق سپریم

کورٹ کا اہم فیصلہ 50

میں محمد قاسم 51



کیس کی حقائق:

ملزم زعم حسن خان کے خلاف مجموعہ تعزیرات پاکستان کے سیکشن ۲۹۵-سی کے تحت ایف آئی آر درج ہوتی ہے جس میں اس پر یہ الزام ہوتا ہے کہ ملزم نے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے ہیں۔ ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد، ٹرائل کورٹ میں اس پر فرد جرم عائد ہونے سے پہلے ملزم کا فاضل وکیل عدالت میں یہ درخواست دیتا ہے کہ ملزم کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے لہذا وہ قانونی طور پر اپنے دفاع کا اہل نہیں، جس پر عدالت انکو آری منعقد کرتی ہے اور میڈیکل بورڈ سے بیان ریکارڈ کروانے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملزم "شیزوفرینیا" 52 کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس بیماری کی تشخیص کے بعد ٹرائل کورٹ دفعہ ۳۶۵ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ملزم کی اس بیماری سے صحت یابی تک عدالتی کارروائی کو ملتوی کر دیتی ہے۔

50 یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے معزز جج سید منصور علی شاہ نے لکھا ہے اور اس کو بحوالہ "کریمینل پیٹیشن نمبر ۱۷۲-۱ ایل آف ۲۰۲۳" کے تحت سپریم کورٹ کی ویب سائٹ پر پڑھا جاسکتا ہے۔

51 طالب علم شریعہ والقان، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

52 "شیزوفرینیا [Schizophrenia] کو اردو میں انشقاق ذہنی بھی کہا جاتا ہے۔ شیزوفرینیا ایک ایسی ذہنی حالت ہے جس میں فرد کی سوچ، پہچانات، احساسات اور کردار بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ مریض کی فکر غیر منظم، گفتگو بے ربط، اور اک غیر حقیقی اور توجہ منتشر ہو جاتی ہے اس کے احساسات نامناسب اور کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ شیزوفرینیا کا مریض حقیقت سے دور خطا اور اوبام کی خیالی دنیا میں رہتا ہے۔"

کاروائی ملٹوی کرنے بعد ٹرائل کورٹ دفعہ ۳۶۵ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کی بجائے اس کو دماغی امراض کے ہسپتال میں قید کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ٹرائل کورٹ کے اس حکم کے خلاف بائی کورٹ میں نظر ثانی دائر کیا جاتا ہے۔ مگر بائی کورٹ اس میں مداخلت سے انکار کرتی ہے اور پھر یہ کیس سپریم کورٹ میں آتا ہے۔

بنیادی سوالات:

1. دفعہ ۳۶۵ مجموعہ ضابطہ فوجداری میں کیس کی کاروائی ملٹوی کرنے کے بعد ملزم کو دفعہ ۳۶۶ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ضمانت پر رہا کرنا چاہیے تھا یا دماغی امراض کے ہسپتال میں قید کرنا چاہیے تھا؟
2. وہ کونسے حالات و واقعات ہیں جس میں ملزم کو دماغی امراض کے ہسپتال میں قید کرنے کو استثناء حاصل ہے؟

عدالت میں بحث:

- پہلے سوال کے جواب میں دفعہ ۳۶۶ مجموعہ ضابطہ فوجداری کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے کہا کہ اگر ملزم دماغی طور پر کمزور یا دماغی مریض ہو اور عدالتی کارروائی میں اپنی دفاع کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اولین ترجیح اس کی ضمانت پر رہائی کو دینی چاہیے نہ کہ اس کو مینٹل ہیلتھ ہسپتال میں قید کرنے کو، کیونکہ بنیادی مقرر کردہ طریقہ کار اس کو رہا کرنا ہے نہ کہ مینٹل ہیلتھ ہسپتال میں اس کو قید کرنا جو کہ ثانوی طریقہ کار ہے۔ مزید یہ کہ عدالت نے معقول ضمانتی چھلکے پر ملزم کی رہائی کو اصول کے طور پر اپنایا جبکہ ملزم کو مینٹل ہیلتھ ہسپتال میں قید کرنے کو غیر معمولی سمجھا۔
 - دوسرے سوال کے جواب میں عدالت نے بتایا کہ چونکہ دفعہ ۳۶۶ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت عدالت کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ملزم کی ضمانت پر رہائی یا مینٹل ہیلتھ ہسپتال میں قید کرنے میں سے کسی ایک عمل کو اختیار کرے۔ تو اس حوالے سے اسی دفعہ کے اندر ۲ شرائط ایسی ہیں جو اس عمل کے متعلق فیصلہ کرتے ہوئے عدالت کی راہنمائی کرتی ہیں۔
- اول: ملزم کے ضامن سے معقول ضمانتی چھلکے لے کر اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ وہ ملزم کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے۔

○ دوم: ملزم کا خیال رکھتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ ملزم اپنے آپ کو اور دوسروں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

مندرجہ بالا شرائط اور حالات و واقعات کو کیس کی نسبت سے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عدالت اس بات کا تعین کرے گی کہ اگر ملزم کو رہا کیا گیا تو اس کے ورثاء اسکی دیکھ بھال کرنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ اس کے بعد اگر عدالت حالات و واقعات کے تناظر میں اس نکتہ نظر پر پہنچتی ہے کہ اس کے ورثاء اس کی ضمانت پر رہائی کے بعد اس کا بہتر خیال رکھیں گے تو عدالت رہائی کو ترجیح دے گی۔

عدالت کا فیصلہ:

اوپر بیان کردہ اصولوں کا موجودہ کیس کے حالات و واقعات پر اطلاق کرتے ہوئے عدالت نے موجودہ ملزم کے ورثاء کو ملزم کا ہر قسم کا خیال رکھنے کی حامی بھرتے ہوئے پایا۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے معزز عدالت نے ملزم کے سابقہ ریکارڈ کو جانچا اور یہ دیکھا کہ ملزم کا ایسا کوئی سابقہ ریکارڈ موجود نہیں جس میں اس نے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہو اور اس کے ورثاء اس کو روکنے میں ناکام ہوئے ہوں۔ نہ ہی حال میں اس نے کسی کو جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے۔ لہذا یہاں کوئی ایسے غیر معمولی حالات و واقعات موجود نہیں ہیں۔ جو دفعہ ۴۶۶ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ملزم کی رہائی کے راہ میں حائل ہوں۔ جس کی بناء پر عدالت نے ملزم کی ضمانت منظور کر لی۔

ایک سے زائد مقدمات میں نامزد ملزم کو، کورٹ کی جانب سے کسی بھی ایک مقدمے میں ضمانت ملنے کے بعد، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے سابقہ مقدمات میں گرفتار کر سکنے/انہ کر سکنے کے اختیارات سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ⁵³

محمد مخدوم شاہ⁵⁴



کیس کے حقائق:

سائل [پیشینشر] دو مختلف ایف۔آئی۔آر جو کہ ۲ جون ۲۰۲۳ اور ۳ اگست ۲۰۲۳ کو ان کے خلاف درج ہو چکے ہوتے ہیں، میں عدالت سے ضمانت قبل از گرفتاری عارضی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ان کو ایک دفعہ پھر ایک تیسرے ایف۔آئی۔آر جو کہ ۲ نومبر ۲۰۲۳ کو ان کے خلاف درج ہو چکا ہوتا ہے، میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ جس میں وہ ضمانت بعد از گرفتاری کے لئے درخواست دیتا ہے۔ سائل آئین کے آرٹیکل ۱۹-اے کے تحت پشاور ہائی کورٹ میں ریٹ پیشینشر دائر کرتا ہے جس میں وہ عدالت سے درج ذیل استدعا کرتا ہے کہ:

عدالت سے یہ استدعا کی جاتی ہے کہ وہ مسؤل علیہم [ریپسائڈٹس] کو یہ حکم دے کہ وہ سائل کو سائل کے خلاف درج تمام فوجداری مقدمات اور زیر التوا اکواریوں کے بابت معلومات فراہم کرے۔ [تاکہ وہ اسی حساب سے اپنا ڈیفینس تیار کر سکے اور عدالت سے ریلیف حاصل کر سکے۔] عدالت مسؤل علیہم کو یہ حکم جاری کرتی ہے کہ وہ اگلی تاریخ کو سائل کے خلاف درج تمام فوجداری مقدمات اور زیر التوا اکواریوں سے متعلق رپورٹ عدالت میں جمع کرائے۔

⁵³ ڈویژن بیجنگ کا یہ انتہائی اہم فیصلہ جسٹس اشتیاق ابراہیم کا تحریر کردہ اور اسے ”اسد قیصر بنام سرکار خیبر پختونخواہ“ یا آئینی درخواست نمبر ۵۲۸۱ پی آف ۲۰۲۳ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁵⁴ طالب علم، شعبہ شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد و ممبر آئین و قانون۔

اس دوران عدالت کے علم میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ زیر غور بیٹیشن کے علاوہ سائل نے ایک اور درخواست بھی عدالت میں جمع کی ہے جس میں اس نے عدالت سے درج ذیل استدعا کی ہے کہ؛

عدالت سے یہ استدعا کی جاتی ہے کہ وہ مسؤل علیہم کو یہ حکم دے کہ وہ سائل کو پہلے سے درج شدہ پرانے ایف۔آئی۔آروں میں گرفتار کرنے سے باز رہے۔ زیر غور بیٹیشن کو بتاریخ ۷ دسمبر ۲۰۲۳ بحث کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اور یوں اس مقدمے کا آغاز ہوتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

کیا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک سے زائد مقدمات میں نامزد ملزم کو، کورٹ کی جانب سے کسی بھی ایک مقدمے میں ضمانت ملنے کے بعد، سابقہ مقدمات کی آڑ میں دوبارہ گرفتار کیا جاسکے؟

وکلہ کے دلائل اور بحث:

عدالت قرار دیتی ہے کہ گو کہ سائل کا زیر غور مقدمہ بالکل سادہ ہے جس میں وہ چاہتا ہے کہ عدالت آئین کے آرٹیکل ۱۹-اے، جو کہ حق معلومات کی بات کرتا ہے، کے تحت مسؤل علیہم کو یہ حکم دے کہ وہ سائل کو سائل کے خلاف درج تمام فوجداری مقدمات اور زیر التوا انکوائریوں کے بابت معلومات فراہم کرے، لیکن عدالت چاہتی ہے کہ اس قانونی نقطے پر ایک حاکمانہ فیصلہ جاری کرے تاکہ اس قضیے کو ہمیشہ کے لئے حل کیا جاسکے۔

اس کے بعد معزز عدالت مجموعہ ضابطہ فوجداری کے مختلف دفعات جیسے کہ دفعہ ۶۲، ۶۱، ۵۴، ۳۶ اور ۱۶۷ کا حوالہ دیتی ہے اور تجزیہ کرتی ہے۔

مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۱۶۷ کا تفصیلی تجزیہ:

دفعہ ۱۶۷ کے ضمن میں تجزیہ کرتے ہوئے معزز عدالت قرار دیتی ہے کہ ریمانڈ کی حیثیت آئین میں درج شخصی آزادی پر قدغن کی ہے اور یہ عمومی قاعدے سے استثناء کی طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ لہذا اس کی تعبیر و تشریح کڑے طور پر ہونی چاہئے تاکہ کھلے ڈھلے طرز پر اور جب تک مذکورہ دفعہ کے سارے لوازمات کو پورا نہ کیا گیا ہو تب تک عدالت کو چاہئے کہ ریمانڈ کی منظوری نہ دے۔

اسی طرح، مذکورہ دفعہ کسی ایسے شخص، جو کہ ایک سے زائد مقدمات میں مطلوب ہو، کے مسلسل اور لگاتار گرفتاری کو متصور نہیں کرتا۔ بلکہ ایک سے زیادہ فوجداری مقدمات میں مطلوب ملزم جب گرفتار ہو گا تو اسے اس کے خلاف درج تمام مقدمات میں گرفتار تصور کیا جائے گا۔ مزید برآں، کسی مقدمے میں گرفتار ملزم سے، اس کے خلاف درج کسی دوسرے مقدمے میں، تفتیش کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے۔ [یعنی کسی ملزم سے ایک ہی گرفتاری میں مختلف مقدمات سے متعلق تفتیش کی جاسکتی ہے اور ہر ایک مقدمے میں ملزم کو تفتیش کے لئے الگ سے گرفتار کرنا لازمی نہیں ہے بلکہ یہ خلاف اصل ہے جیسا کہ معزز عدالت نے بیان کیا۔] قانوناً بھی مناسب ہے کہ جب کسی ملزم، جو کہ ایک سے زائد مقدمات میں مطلوب ہو یا اس کے خلاف ایک سے زائد ایف۔آئی۔آر درج ہوں، کو گرفتار کیا جائے اور اس کو جسمانی ریمانڈ پر دے دیا جائے تو تفتیشی ادارے کو چاہئے کہ وہ اس ملزم سے اس کے خلاف درج جملہ مقدمات میں تفتیش کرے۔

معزز عدالت نے قرار دیا کہ مجموعہ ضابطہ فوجداری اور پولیس رولز میں کہیں پر بھی یہ نہیں لکھا کہ جب ایک سے زائد مقدمات میں مطلوب ملزم کو کسی مقدمے میں گرفتار کیا جائے گا تو اسے صرف اسی مقدمے میں گرفتار تصور کیا جائے گا۔ اور نہ ہی یہ کہ کسی ملزم کو بیک وقت ایک سے زیادہ مقدمات میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔

عدالت قرار دیتی ہے کہ یہ دفعہ محض یہ بتاتا ہے کہ مجسٹریٹ گرفتار کئے گئے یا حراست میں لئے گئے شخص کو زیادہ سے زیادہ ۱۵ دن تک ریمانڈ میں دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ دفعہ کسی خاص کیس کی بات نہیں کرتا بلکہ یہ صرف حراست [کسٹڈی] کی بات کرتا ہے۔ فلذا ایک سے زائد مقدمات میں مطلوب ملزم کو ۱۵ دن سے زیادہ حراست میں رکھنا غیر قانونی ہے۔ کیونکہ یہ بات زیادہ قانون سے مطابقت رکھتی ہے کہ ایک سے زائد فوجداری مقدمات میں مطلوب ملزم جب گرفتار ہو جائے تو اسے اس کے خلاف درج تمام مقدمات میں گرفتار سمجھا جائے گا۔

اعلیٰ عدالتوں کی نظائر کا حوالہ دیتے ہوئے معزز عدالت نے کہا کہ اعلیٰ عدالتیں یہ قرار دیتی ہیں کہ اس مملکت کے ہر شہری کی [شخصی] آزادی کو آئین کے آرٹیکل ۴، ۹، ۱۰-اے اور آرٹیکل ۱۵ کا تحفظ حاصل ہے۔ لہذا کسی بھی ایسے غیر معقول اور بلا سبب/وجہ فعل، جو شہریوں کی آزادی کو

محدود کرتا ہو یا سرے سے ختم کرتا ہو، کا آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت محاسبہ کیا جائے گا بلکہ دراصل یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کی آزادی کو یقینی بنائیں۔
محرم عدالت نے سپریم کورٹ کے فیصلے [صغراں بی بی بنام ریاست] کا متعلقہ حصہ بھی نقل کیا ہے۔ جس میں سپریم کورٹ نے فرار دیا ہے کہ:

کسی شخص کو محض کسی ایف۔آئی۔آر میں نامزدگی کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ تفتیشی افسر کو اس بات کا اطمینان ہو کہ اس کے پاس ملزم کی گرفتاری کے لئے معقول جواز موجود ہو اور اسکو اپنے اطمینان کے لئے ضابطہ فوجداری اور پولیس رولز سے رہنمائی لینی ہوگی [نہ کہ اطمینان کے اپنے بنائے ہوئے تصور سے]۔ لہذا تفتیشی افسر کو چاہئے کہ وہ گرفتاری کو اس وقت تک مؤخر کرے جب تک اس کے سامنے اہم ثبوت سامنے نہ آئے اور اسکو مطمئن نہ کر دے جو بادی النظر میں ملزم کا اُس جرم میں ملوث ہونے پر دلالت کرتا ہو۔

عدالت کا فیصلہ:

چنانچہ یہ رٹ پیشکش، عدالت کے درج ذیل احکام کے تحت، اپنے فیصلہ کن انجام کو پہنچتی ہے کہ:

1. مسؤل علیہم سائل کو اس کے خلاف درج تمام فوجداری مقدمات اور زیر التوا انکوائریوں کے بابت معلومات فراہم کرے۔
2. مسؤل علیہم سائل کو، اس کے [ضمانت پر] رہا ہونے کے بعد، ان مقدمات میں بار بار گرفتار کرنے سے باز رہے جو اس کی گرفتاری سے قبل اس کے خلاف درج ہو چکے ہیں۔

بچے کے ساتھ ریپ کے کیس میں بچے کی واحد گواہی پر ملزم کو سزا سنانے کے حوالے

سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ 55

حمزہ خان⁵⁶



کیس کے حقائق:

مستغیث محمد جاوید نے بمورخہ ۴ فروری ۲۰۲۱ء تھانے میں درخواست دی کہ اس کا بیٹا "الف" بعمر ۱۰ سال تحصیل چشتیاں ضلع بہاولنگر کے ایور گرین نامی پبلک سکول میں چوتھے جماعت کا طالب علم ہے۔ جب الف بمورخہ ۲ فروری ۲۰۲۱ء سکول سے واپس آیا تو وہ انتہائی خوفزدہ ہو کر بخار میں مبتلا تھا۔ الف نے روتے ہوئے محمد شبیر، محمد اکرم اور محمد یاسین کے روبرو یہ بتایا کہ وہ آئندہ سکول نہیں جائے گا کیونکہ پرنسپل امداد اللہ [ایبیل کنندہ] روزانہ اسے اپنے دفتر بلا کر اس کے ساتھ جنسی طور پر چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ مذکورہ بالا تاریخ کو بھی ایپیلانٹ نے سکول کی چھٹی سے کچھ دیر پہلے الف کو دفتر بلایا، دروازے کی چنجنی چڑھائی اور اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ اس کے بعد ایبیل کنندہ نے الف کو سخت دھمکیاں دے کر کسی کو بھی بتانے سے منع کیا۔ مستغیث نے برخلاف ایبیل کنندہ اپنے بیٹے "الف" کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بابت ایف آئی آر درج کروایا۔ مستغیث نے بدوران ٹرائل پانچ گواہان، مستغیث محمد جاوید [پی ڈبلیو-۱]، محمد شبیر [پی ڈبلیو-۲]، الف [پی ڈبلیو-۳]، ڈاکٹر محمد ادریس [پی ڈبلیو-۴]، اور تفتیشی افسر محمد اسلم [پی ڈبلیو-۵] پیش کئے۔ ایبیل کنندہ اپنے بیان زیر دفعہ ۳۴۲ [ض ف] میں یہ بیان دیا کہ اس کے خلاف جھوٹی ایف آئی آر درج کروانے کی واحد وجہ اس کا اپنی بیوی نسیم کوثر کو طلاق دینا ہے۔ پس مستغیث نے یہ ایف آئی

⁵⁵ ڈویژن شیخ کا یہ انتہائی اہم فیصلہ جسٹس طارق سلیم شیخ کا تحریر کردہ ہے جو کریمینل ایبیل نمبر ۴۴۸ آف

۲۰۲۲ء حوالے کے ذریعے پڑھا جا سکتا ہے۔

⁵⁶ ایڈووکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

آر بہ ایماء و سازش سسرال اپیلانٹ و پولیس درج کروایا ہے۔ تاہم اپیلانٹ نے نہ تو دفعہ ۳۴۰[۲] کے تحت برحلف بیان دیا اور نہ ہی اپنے دفاع میں کوئی گواہ پیش کیا۔ ایڈیشنل سیشن جج صاحب نے بمورخہ ۲۵ اگست ۲۰۲۲ فیصلہ سناتے ہوئے ملزم کو دفعہ ۳۷۷-بی مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت ۱۴ سال قید باسقت بمعہ ۱۰ لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ مذکورہ فیصلے سے رنجیدہ ہو کر اپیل کنندہ نے اپیل ہذا دائر کیا۔

عدالت عالیہ کے سامنے بنیادی سوال:

1. کیا بیچے کی شہادت کی اہلیت جانچنے کے لئے وائر ڈائر ٹیسٹ کروانا لازمی ہے؟ کیا اس ٹیسٹ کے بغیر بیچے کی گواہی ناقابل ادخال شہادت ہے؟
2. کیا جنسی زیادتی کے شکار واحد بیچے کی شہادت پر ملزم کو سزا سنائی جاسکتی ہے؟

دکلا کے دلائل:

اپیل کنندہ کے وکیل کے دلائل:

اپیل کنندہ کے وکیل نے موقف اپنایا کہ دفعہ ۳ اینٹی ریپ ایکٹ ۲۰۲۱ کے تحت شیڈول جرائم کو سننے کا اختیار صرف خصوصی عدالتوں کو ہے۔ عدالت مذکور خصوصی عدالت نہ ہونے کی بناء پر اس کو اختیار سماعت نہیں حاصل۔ مزید یہ کہ ایف آئی آر کا اندراج کافی تاخیر سے ہوا، اپیلانٹ کو بہ ایماء و سازش سسرال اپیلانٹ و پولیس پھنسیا گیا اور [پی ڈبلیو-۱]، و [پی ڈبلیو-۲]، وقوعے کے چشم دید گواہ نہ تھے۔

وکیل استغاثہ کے دلائل:

وکیل استغاثہ نے موقف اپنایا کہ عدالت مذکور ۲۰۲۱ کے ایکٹ کے تحت باقاعدہ طور پر نوٹیفانڈ تھا۔ پس عدالت مذکور کو اختیار سماعت حاصل تھا۔ مزید یہ کہ الف کا بیان استغاثہ کے کیس کی بھرپور حمایت کرتا ہے کیونکہ وہ جرح کے دوران بالکل ثابت قدم رہا ہے۔ اسی طرح [پی ڈبلیو-۱]، اور [پی ڈبلیو-۲]، کے بیانات بھی الف کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ مزید برآں، وائر ڈائر ٹیسٹ نہ کروانے کی وجہ سے کیس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور جھوٹی اور سازشی ایف آئی آر کے بابت وکیل ملزم نے کسی قسم کی شہادت پیش نہیں کی۔

چند تکنیکی سوالات:

عدالت عظمیٰ نے میرٹ پر آنے سے پہلے تکنیکی سوالات پر بحث کچھ یوں کی۔
 وفاقی حکومت نے محمد نواز بھٹی، ایڈیشنل سیشن جج صاحب چشتیاں کو ۲۰۲۱ ایکٹ کے دفعہ ۳ کے
 تحت خصوصی عدالت بروئے نوبٹیکیشن مورخہ ۱۱ مئی ۲۰۲۲ قرار دیا تھا۔ پس وکیل ملزم کا یہ
 موقف کہ عدالت مذکور نے دستخط کرتے وقت اپنے نام کے ساتھ خصوصی عدالت نہیں لکھا تھا،
 انتہائی تکنیکی نوعیت کا ہے جو کہ قانونی اثر نہیں رکھتا۔

اسی طرح عدالت عظمیٰ نے ایف آئی آر میں تاخیر کو جسٹیفائڈ قرار دیا کیونکہ بچوں کے ساتھ
 جنسی زیادتی کے کیسز میں عموماً لاعلمی، شرم، خوف، اور دھمکیوں کی وجہ سے متاثر فریق بروقت
 رپورٹ نہیں کر پاتا۔

عدالت کا فیصلہ:

پہلے سوال کے جواب کے لئے عدالت عالیہ نے کینیڈین سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے
 ہوئے گواہ کے اہلیت کے لئے ۳ معیارات کا ذکر کیا: گواہ کے مشاہدے اور تشریح کی صلاحیت،
 یاد رکھنے کی صلاحیت اور بیان کرنے کی صلاحیت۔ اگر گواہ میں یہ تینوں معیارات پائے جائے تو
 وہ گواہی دینے کا اہل ہوگا۔ اس کے بعد عدالت "ایڈمیسیبلیٹی" اور "ایویڈینشری ویلیو" کے مسئلے
 پر غور کرے گی۔ اگر گواہی مقدمہ کے ساتھ متعلق ہوگی تو وہ "ایڈمیسیبل" یعنی قابل ادخال
 شہادت ہوگی۔ اسی طرح "ایویڈینشری ویلیو" کے تعین کے لئے عدالت گواہ کے کردار، بیان میں
 داخلی تضادات اور دوسرے گواہان کے بیانات کے ساتھ تضاد جیسے امور کو دیکھے گی۔

قانون شہادت کا آرٹیکل ۳ اور ۷ گواہ کی گواہی کی اہلیت کو عمر کے ساتھ ہرگز مشروط نہیں کرتا
 ۔ اگر کوئی بچہ بھی سوال کو سمجھنے اور اس کا منطقی جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو تو وہ گواہی دینے
 کے لیے اہل تصور کیا جائے گا۔ اسی لئے عدالتیں بچوں کی گواہی کی اہلیت کے لئے وائر ڈائر
 ٹیسٹ منعقد کرواتی ہے اور گواہ کے سامنے مختلف سوالات رکھتی ہے کہ آیا گواہ سوالات کو سمجھنے
 اور منطقی جوابات دینے کی ذہانت رکھتا ہے؟ اگر ہاں، تو وہ گواہی دینے کا اہل قرار دیا جاتا ہے اور
 اس کا بیان باقاعدہ طور پر قلمبند کروایا جاتا ہے۔

عدالت عالیہ نے مختلف ملکی اور بیرونی جیورینڈکشن کے عدالتوں کے فیصلہ جات کا حوالہ دیتے
 ہوئے قرار دیا کہ اگرچہ عدالتوں کو بچوں کی شہادت کی اہلیت جانچنے کے لئے وائر ڈائر ٹیسٹ /

ریشٹنٹی ٹیسٹ منعقد کروانا چاہیے، تاہم یہ لازمی نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی اگر عدالت بچے کے انداز و اطوار سے مطمئن ہو کر سمجھتی ہے کہ بچے سوالات سمجھنے اور منطقی جوابات دینے کا اہل ہے تو ایسے بچے کی گواہی بالکل قابل ادخال شہادت ہو سکتی ہے۔

دوسرے سوال کے جواب میں عدالت عالیہ نے مختلف فیصلہ جات کا جائزہ لے کر یہ قرار دیا کہ بچے اپنی کم عمری کی وجہ سے عموماً انتہائی ناقابل اعتبار گواہان ہوتے ہیں کیونکہ یہ خواب کو حقیقت سمجھتے ہیں، لوگوں کی باتوں میں آتے ہیں اور جزا کی امید اور سزا کا خوف بھی ان پر جلد اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ صرف ایک بچے کی گواہی پر مکمل انحصار نہ کیا جائے اور تائیدی شہادت کا مطالبہ کیا جائے۔ اسی کو "رول آف پروڈنٹس" کہتے ہیں، تاہم یہ ہرگز کوئی قاعدہ یا قانون نہ ہے۔

دوسری طرف جنسی جرائم نجی نوعیت کے ہوتے ہیں اور عموماً متاثر بچے کے علاوہ کوئی اور گواہ موجود نہیں ہوتا، اس لئے اگر صرف متاثر بچے کی شہادت کیس کے مخصوص حالات و واقعات میں قابل اعتماد معلوم ہوتی ہو تو عدالتوں کو اضافی شہادت پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

موجودہ کیس میں الف پر بھرپور جرح کی گئی، تاہم وہ بدوران جرح بالکل ثابت قدم رہا اور کہیں بھی اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا۔ لہذا اس کی شہادت "کریڈبل" یعنی قابل اعتماد شہادت ہے، تائیدی شہادت کی ضرورت نہیں ہے، اور واحد الف کی شہادت پر بھی ملزم کو سزا ہو سکتی ہے۔ وکیل ملزم نے اعتراض اٹھایا کہ [پی ڈبلیو-۱]، اور [پی ڈبلیو-۲]، وقوعے کے عینی گواہ نہیں تھے اور ان کی گواہی "سنی سنائی شہادت"⁵⁷ کے زمرے میں آتی ہے۔ اگرچہ اصولاً سنی سنائی بالواسطہ شہادت قانونی اثر نہیں رکھتی تاہم اس اصول کے کئی مستثنیات موجود ہیں۔ چونکہ جنسی زیادتی کے کیسز میں عموماً متاثر بچے کے علاوہ کوئی اور عینی گواہ موجود نہیں ہوتا، اس لئے اگر بچے کسی شخص کو وقوعے کے واقعات بتائے تو ایسے شخص کی بالواسطہ شہادت بطور تائیدی شہادت قابل ادخال شہادت ہو سکتی ہے۔

⁵⁷ Hearsay Evidence.

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں عدالت عالیہ نے اپیلانٹ کا اپیل خارج کیا اور ایڈیشنل سیشن جج صاحب چشتیاں ضلع بہاولنگر کا فیصلہ برقرار رکھا۔

خلاصہ:

جنسی زیادتی کے کیس میں بچے کی شہادت کی اہلیت جانچنے کے لئے وارنڈر ٹیسٹ کروانا لازمی نہیں ہے اور اس ٹیسٹ کے بغیر بھی بچے کی گواہی قابل ادخال شہادت ہو سکتی ہے۔ اگر بچہ سوال کو سمجھ کر منطقی جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہے تو عدالت اسے اہل گواہ سمجھتے ہوئے اس کا بیان قلمبند کروا سکتی ہے۔ نیز ایسے بچے کی واحد شہادت پر بھی سزا سنائی جا سکتی ہے اگر مقدمہ کے مخصوص حالات میں ایسے گواہ کی گواہی قابل اعتماد معلوم ہوتی ہو۔ نیز اگر بچے نے وقوعے کے متعلق کسی شخص کو بتایا ہو تو ایسے شخص کی بالواسطہ گواہی بطور تائیدی شہادت قابل ادخال شہادت ہو سکتی ہے۔

عدالت عظمیٰ کا تفتیشی افسر کی جانب سے تفتیش میں بے ایمانی کرنے پر ملازمت سے برطرف کرنے کے حوالے سے انتہائی اہم فیصلہ⁵⁸

شازیہ نصیر وارثیہ⁵⁹



کیس کے حقائق:

درخواست گزار تھانہ مومن آباد ضلع ویسٹ، کراچی میں بطور سب-انسپیکٹر تفتیشی ونگ میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا درخواست گزار پر ایک واقعہ کے دوران دفعہ ۳۷۶ مجموعہ تعزیرات

⁵⁸ یہ فیصلہ جناب جسٹس محمد علی مظہر نے تحریر کیا ہے اور کیس حوالہ "۲۰۲۳ ایس سی ایم آر صفحہ ۹۴" کے تحت عدالتی ریکارڈ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

⁵⁹ ایل ایل بی، شریعہ و قانون و ممبر آئین و قانون.

پاکستان کے تحت درج عصمت دری کے معاملے کو دفعہ ۵۱۱ مجموعہ تعزیرات پاکستان میں تبدیل کر دینے کا الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس طرح اس نے زیادتی کے ہو جانے کو زیادتی کے ارتکاب کی کوشش میں بدل دیا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ سات سال کی بچی کا ریپ ہوتا ہے جس میں اس کا والد عینی شاہد ہے اور متاثرہ لڑکی کی فرج سے خون نکلنے کی حالت میں ہی بچی کو ہسپتال منتقل کیا جاتا ہے جہاں اس کے طبی معائنے سے ریپ کا ہونا ثابت ہو گیا۔ اس بابت شکایت ملنے پر ڈی آئی جی پولیس ویسٹ زون کراچی نے درخواست گزار کو شو کاژ نوٹس جاری کر دی۔ درخواست گزار نے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے شو کاژ نوٹس کا جواب جمع کروایا۔ اس نے ۸ جون ۲۰۲۰ کو ایک محکمہ ایبل دائر کی جس کے بعد اسے ۱۳ اگست ۲۰۲۰ کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور اس ایبل کو ۱۷ ستمبر ۲۰۲۰ کو ایبل آرڈر کے ذریعے مسترد کر دیا گیا۔ نتیجتاً درخواست گزار نے سندھ سروس ٹریبونل کراچی میں سروس ایبل دائر کی جسے ۳۱ مارچ ۲۰۲۲ کو خارج کر دیا گیا۔ درخواست گزار نے سندھ سروس ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف یہ ایبل عدالت عظمیٰ میں دائر کروائی۔

دکلا کے دلائل:

درخواست گزار کے وکیل نے مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ درخواست گزار کی طرف سے کسی بھی غلط روی کا ارتکاب نہیں کیا گیا۔ فاضل وکیل نے مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۱۶۳ کے تحت درج متاثرہ بچی کے بیان کا بھی حوالہ دیا اور دلیل دی کہ یہ بیان اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ملزم ریپ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا اس لیے درخواست گزار نے جو حتمی چالان جمع کرایا اس میں ”مجموعہ تعزیرات پاکستان“ کے دفعہ ۳۷۶ کی جگہ دفعہ ۵۱۱ شامل کیا ہے۔

- استغاثہ نے ٹریبونل کے فیصلے کی حمایت کی اور دلیل دی کہ دستاویزی شواہد کی موجودگی کی بناء پر تفتیشی افسر کی حیثیت سے درخواست گزار کی کارکردگی میں خامیوں اور بے ایمانی کا انکشاف ہوا۔ لہذا مجاز تھارٹی نے درخواست گزار کو درست طور پر برخاست کر دیا تھا۔

عدالت میں بحث:

درخواست گزار نے محکمہ کارروائی کے دوران اس بات سے کبھی انکار نہیں کیا کہ متاثرہ کے والد اس واقعہ کے عینی شاہد تھے جنہوں نے ریپ کے جرم میں ایف آئی آر درج کرائی تھی۔

درخواست گزار نے کہیں بھی اس میڈیکل رپورٹ پر اعتراض نہیں کیا جس میں متاثرہ لڑکی کے ہائمن کے ٹوٹنے اور خون بہنے کی نشاندہی کی گئی تھی، جس سے عصمت دری کا ارتکاب ثابت ہوتا ہے، نہ ہی کیمیکل ایگزامز کی رپورٹ کو چیلنج کیا جس میں متاثرہ کی شلوار اور وچائل سویب میں انسانی نطفے کی موجودگی کی تصدیق کی گئی تھی۔ ان زبردست شواہد کے پیش نظر تفتیشی افسر کے پاس دفعہ ۵۱۱ مجموعہ تعزیرات پاکستان شامل کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا، جو استغاثہ کے کیس کو کمزور کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک تفتیشی افسر فوجداری انصاف کے نظام اور تحقیقاتی رپورٹ کے جزو میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تاہم بعض اوقات ناکام تحقیقات انصاف کی فراہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ پولیس رولز ۱۹۳۴ کے قاعدہ ۲۵-۲ کے تحت اور ذیلی قاعدہ ۳ کے تحت یہ شرط رکھی گئی ہے کہ زیر تفتیش معاملے کی سچائی کا پتہ لگانا تفتیشی افسر کی ذمہ داری ہے۔ دفعہ [۲]۱۶۶ [مجموعہ تعزیرات پاکستان، انسداد دہشت گردی ایکٹ ۱۹۹۷ کی دفعہ ۲۷، انسداد ریپ [تحقیقات اور ٹرائل] ایکٹ، ۲۰۲۱ کی دفعہ ۲۲ کے تحت تفتیشی افسر اپنی ذمہ داری میں ناکامی کی صورت میں سزاؤں کا مستحق ہے۔

اسی بحث کے دوران عدالت عظمیٰ نے مشہور زمانہ کیس ”صغریٰ بی بی بنام ریاست“⁶⁰ اور ”بابو بھائی بنام ریاست گجرات“ کا حوالہ دیا جو تفتیش اور تفتیشی آفیسر کی ذمہ داری کے بارے میں ہیں۔

میڈیکو لیگل رپورٹ اور کیمیائی تجزیے کی رپورٹ میں متاثرہ بچی کے ریپ کی تصدیق ہو گئی۔ تاؤبیہ کارروائی میں مجاز اتھارٹی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ درخواست گزار نے متاثرہ کے والد کی گواہی کو نظر انداز کر کے سات سالہ بچی کے بیان کی بنیاد پر دفعہ ۳۷۶ کی بجائے ۴۱۱ مجموعہ تعزیرات پاکستان شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

⁶⁰ پی ایل ڈی ۲۰۱۸ سپریم کورٹ ۵۹۵۔

فیصلہ:

عدالت عظمیٰ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ خود وضاحتی دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر تادیبی کارروائی کرتے ہوئے سروس سے برطرفی کی گئی تھی۔ مذکورہ بالا بحث کے پیش نظر عدالت عظمیٰ کو فاضل ٹریبونل کی جانب سے دیے گئے فیصلے میں کوئی غیر قانونی بات یا غلط فہمی نظر نہیں آتی۔ نتیجتاً، یہ پیشین خارج کر دی جاتی ہے۔

ملٹی کوتاہی پر ہونے والی ایف آئی آر کی قانونی حیثیت سے متعلق پشاور ہائی کورٹ کا

اہم فیصلہ⁶¹

محمد بلال⁶²



کیس کے حقائق:

۱۲۹ اکتوبر ۲۰۲۲ کو شکایت کنندہ [جو زیر غور رٹ پیشین میں ریسپانڈنٹ ہے] اپنی حاملہ بیوی خدیجہ بی بی کو ڈیلوری کے لیے وہاب میڈیکل کمپلیکس لاتا ہے۔ وہاں ڈاکٹر [جو زیر غور رٹ پیشین میں درخواست گزار ہے] ان کو بتاتی ہے کہ یہ خدیجہ بی بی کی زچگی کا مناسب وقت نہیں ہے۔ خدیجہ بی بی کو ڈاکٹر کی ہدایت پر اگلے دن یعنی ۳۰ اکتوبر ۲۰۲۲ کو دوبارہ زچگی کے لیے لایا جاتا ہے اور دو پہنچانے کے لیے جراحی کی جاتی ہے۔ دوا کے چند قطرے کنولہ کے ذریعے جسم میں جاتے ہیں اور خدیجہ بی بی وفات پا جاتی ہے۔

⁶¹ یہ فیصلہ جناب جسٹس محمد نعیم انور صاحب نے تحریر کیا اور اس کیس کو "رٹ پیشین نمبر ۷۷۷-۱۷۱ سال ۲۰۲۳" کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁶² طالب علم، شریعہ اینڈ لاء اسلامیا کالج یونیورسٹی پشاور و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

۱۵ نومبر ۲۰۲۲ کو شکایت کنندہ پولیس کو رپورٹ کرتا ہے اور پولیس ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۵۱[۳] کے تحت معاملے کی تفتیش کرتے ہوئے فورینزک رپورٹ مرتب کرتی ہے اور اس کی بنیاد پر ڈاکٹر کی کوتاہی مانی جاتی ہے اور ڈسٹرکٹ پبلک پراسیکیوٹر کے مشورے سے ڈاکٹر کے خلاف تعزیرات پاکستان کے تحت قتل بالسبب کی ایف آئی آر درج ہوتی ہے۔
ڈاکٹر عالیہ الیاس (درخواست گزار) ایف آئی آر کے خلاف زیر غور رٹ پٹیشن دائر کرتی ہے۔ کو رد کرنے کے لئے عدالت عالیہ کے سامنے رٹ پٹیشن دائر کرتی ہے۔

بنیادی سوال:

اگر کسی معاملے میں صوبائی حکومت نے تادیبی کارروائی کے لیے کوئی خاص قوانین موجود بنائے ہوئے ہیں تو اور اُس خاص قانون کے دائرے میں آنے والی کوتاہی یا جرم پر مونے والی ایف آئی آر کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟

وکلاء کے دلائل:

درخواست گزار یعنی ڈاکٹر کے وکیل نے عدالت کے سامنے استدعا کی کہ اس نوعیت کا کوئی بھی معاملہ جو کہ طبی کوتاہی سے منسلک ہو اس کا دائرہ اختیار خیر پختونخواہ ہیلتھ کیئر کمیشن ۲۰۱۵ کے دفعہ ۳ کے تحت آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کارروائی کا بنیادی حق صرف خیر پختونخواہ ہیلتھ کیئر کمیشن کا بنتا ہے کیونکہ یہ قانون اس قسم کے معاملات کیلئے مخصوص ہے۔ علاوہ ازیں وہ عدالت سے ایف آئی آر کو ختم کرنے کی استدعا اس اہم رول پر کرتے ہیں کہ جہاں خاص قوانین موجود ہوں تو وہاں خاص قوانین کو عام قوانین پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے درخواست گزار کے وکیل نے بہت سے عدالتی فیصلوں کا حوالہ بھی دیا۔

شکایت کنندہ کے وکیل نے اس بات پر زور دیا کہ ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے ایک قیمتی جان گئی اور جو کارروائی ہوئی ہے وہ بالکل قانون کے مطابق ہے۔ اس کے ساتھ شکایت کنندہ کے وکیل نے معروضات پیش کرتے کہا کہ یہاں ایک قابل دست اندازی جرم سرزد ہوا ہے اور ضابطہ فوجداری کے تحت یہ ایف آئی آر واپس نہیں لی جاسکتی اور جہاں تک سوال ملزم کی معصومیت کا ہے وہ ٹرائل کورٹ شواہد کو مد نظر رکھ کر کرے گی۔ شکایت کنندہ کے وکیل نے استدعا کی کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بادی النظر میں اگر کوئی جرم سرزد ہوا ہو تو ایف آئی آر ختم نہ

کی جائے۔ شکایت کنندہ کے وکیل نے اسی کے ساتھ ہی اپنے حق میں بہت سی عدالتی فیصلوں کا حوالہ دیتی ہے۔

فیصلہ:

درخواست گزار کا شوہر ایک پرائیویٹ ہسپتال، وہاب میڈیکل کمپلکس، چلاتا ہے جو کہ “ہیلتھ کیئر اسٹیبلشمنٹ” ایکٹ کے دفعہ کے تحت چل رہا ہے جہاں پر درخواست گزار بطور لیڈی ڈاکٹر اپنے [۲] فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ عدالت یہ بھی کہتی ہے اس ایکٹ دفعہ ۳۳ اس ایکٹ کو عام قانون پر مقدم بناتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عدالت اس ایکٹ کے دفعہ ۱۹ کو بھی واضح کرتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ کوئی بھی قانونی کاروائی جو کہ ہیلتھ کیئر سروس کے زمرے میں آتی ہو، وہ “ہیلتھ کیئر اسٹیبلشمنٹ” کا دائرہ اختیار ہے۔ عدالت واضح کرتی ہے کہ ہیلتھ کیئر سروس کے نوعیت کے شکایت ہیلتھ کیئر اسٹیبلشمنٹ ”کے دفعہ ۱۳ تحت ہیلتھ کیئر کمیشن کو دائر کی جاسکتی ہے۔ آخر میں عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ ایف آئی آر کو ختم کیا جاتا ہے اور شکایت کنندہ کو درست فورم پر شکایت کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

قتل کے مقدمے میں قصاص اور تعزیر کی سزائوں کے نفاذ کا تعین کے حوالے سے سپریم

کورٹ کا فیصلہ⁶³

اعزاز احمد غنی⁶⁴



کیس کے حقائق:

اس کیس میں جواب دہندہ محمد اسلم جس کو ٹرائل کورٹ نے دفعہ ۳۰۲ کے تحت تعزیراً سزا سنائی تھی، دوران ٹرائل محمد اسلم نے دعویٰ کیا کہ جرم کے وقت وہ ناہالغ تھا اور بطور ثبوت اس نے سکول لیونگ سرٹیفیکیٹ پیش کیا لہذا اس کو سزا ۳۰۲ [بی] کے بجائے ۳۰۶ [الف] میں ہونی چاہیے۔

بنیادی سوال:

عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ دفعہ ۳۰۸ جو کہ ایسے معاملات میں سزا کی معلومات فراہم کرتی ہے جہاں قتل عمد میں قصاص کا حق نہ بنتا ہو تو کیا اس رعایت تعزیر کی سزائوں پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے؟

عدالت کا استدلال:

جسٹس آصف سعید کھوسہ نے اکثریتی فیصلہ لکھتے ہوئے استدلال کیا کہ:

1. مجموعہ تعزیرات پاکستان پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی بھی دفعہ کسی جرم کو بیان کرتی ہے تو ساتھ میں اسی دفعہ کے ضروری اجزاء کو بھی بیان کرتی ہے پھر وہی دفعہ یا اس کے بعد والی دفعہ اس جرم کے سزا کا تعین

⁶³ اس کیس کو ان حوالوں کے ذریعے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ "کریمنل ایبل نمبر ۲۶ آف ۲۰۱۲ یا پی ایل ڈی ۲۰۱۵ سپریم

کورٹ صفحہ ۷۷۔"

⁶⁴ طالب علم، شریعہ اینڈ لاء و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

- کرتی ہے۔ مگر دفعہ ۳۰۶ کو پڑھنے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اس دفعہ میں کسی بھی جرم کے اجزاء کا ذکر شامل نہیں ہے بلکہ صرف یہ بیان کرتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو قصاص کے تحت سزا نہیں دی جائیگی۔ لہذا یہ الگ سے سزا تجویز نہیں کرتی بلکہ صرف استثنائی صورتوں کو بیان کرتی ہے۔
2. چونکہ ۳۰۶ و ۳۰۷ عام طور پر قصاص ۳۰۲ [الف] کی استثنائی صورتوں کو بیان کرتی ہے لہذا ان دفعات کی رعایت بھی صرف اور صرف قصاص کی صورت ہوگی تاکہ تعزیر کی صورت میں۔
3. جس طرح صرف سزا تجویز کرنے والی دفعہ کو الگ جرم بنانے والی دفعہ نہیں سمجھا جاتا اسی طرح سزا میں نرمی کا ذکر کرنے والی دفعہ کبھی بھی سزا کا تعین کرنے والی بنیادی دفعہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔
4. قصاص کیلئے گواہی کا معیار دفعہ ۳۰۴ کے مطابق ہونا ضروری ہے اگر اس کے مطابق نا ہو تو سزا تعزیر کے تحت ہوتی ہے۔ جس کی صورت میں ۳۰۸ کی رعایت دستیاب نا ہوگی۔

جسٹس اعجاز افضل خان کا اختلافی نوٹ:

- جسٹس اعجاز افضل خان نے اکثریتی فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ دفعہ ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸ جن میں قصاص کے مقدمات میں سزا میں نرمی کا اختیار موجود ہے تو اس نرمی کا فائدہ اس مجرم کو بھی ہونا چاہیے جس کو تعزیر کے تحت سزا ہوئی ہے۔
1. اگر ۳۰۲ کو ۳۰۶ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دفعہ ۳۰۶ دفعہ ۳۰۲ کا ہی تسلسل ہے۔ جس طرح ۳۰۲ [ب، و، ج] ان حالات کو بیان کرتی ہے جن حالات میں قصاص کا اطلاق نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر ۳۰۶ کے ذیلی دفعات کو پڑھا جائے تو وہ بھی ان حالات کو بیان کرتا ہے جن میں قصاص کا اطلاق نا ہوگا، جس سے یہ دفعہ ۳۰۲ کے ذیلی کا تسلسل ہی معلوم ہوتا ہے۔

2. اگر قصاص کے تحت سزا یافتہ کو دفعہ ۳۰۸ کی رعایت حاصل ہے جس کیلئے ثبوت کا معیار نسبتاً سخت ہے تو اسی زمی کو تعزیر کی سزائوں جس کیلئے ثبوت کا معیار بھی نسبتاً نرم ہے تک کیوں نہیں بڑھایا جاسکتا۔
3. وہ قتل عمد جو کہ نابالغ، باپ/دادا یا مقتول کے براہ راست اولاد کے ہاتھوں ہوا ہو روز اول سے ہی قصاص کے مستحق نہیں ہے کیونکہ دفعہ ۳۰۶ میں بیان کئے گئے حالات [نابالغ، باپ/دادا یا مقتول کی براہ راست اولاد] روز اول سے ہی مجرم سے جڑے ہوتے ہیں تو ایسے میں اس کو ۳۰۴ [ثبوت] سے جوڑنا خلاف عقل ہوگا کہ اگر ۳۰۴ کے تحت ثابت ہوا تب ۳۰۸ میں حاصل رعایت دستیاب ہوگی بصورت دیگر نہیں۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت نے ۲-۳ کی اکثریت سے فیصلہ سنایا کہ قصاص و تعزیر دو الگ و مختلف اصطلاحات ہے جو کہ ایک دوسرے سے جدا و غیر متداخل ہے دفعہ ۳۰۸، دفعہ ۳۰۴ [الف] کی بعض استثنائی صورتوں میں متبادل سزا بیان کرتا ہے جس کو تعزیر کی صورت میں لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ اکثریتی فیصلے کو جسٹس آصف سعید کھوسہ نے تحریر کیا جس سے جسٹس دوست محمد و جسٹس قاضی فائز عینی نے اتفاق کیا جبکہ جسٹس اعجاز افضل خان نے اختلافی نوٹ لکھا جس سے جسٹس اعجاز احمد چودھری نے اتفاق کیا۔

عدالت سے ضمانت شدہ ملزم کو، اسی مقدمے میں نئے جرائم کے اضافے کی صورت میں

گرفتار کرنے/انہ کرنے کے اختیارات کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا اہم فیصلہ⁶⁵

محمد مخدوم شاہ⁶⁶



کیس کے حقائق:

راشد حسن بٹ نامی شخص کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۸۱-اے کے تحت ایف-آئی-آر درج ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں راشد حسن بٹ، ضمانت قبل از گرفتاری عارضی کی درخواست دائر کرتا ہے جو کہ سیشن کورٹ سے منظور ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد ازاں تفتیشی افسر مقدمے میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۴۲۰، ۴۶۸ اور ۴۷۱ کے تحت مذکور جرائم کا اضافہ کرتا ہے اور ان اضافہ شدہ جرائم کی بنیاد پر راشد حسن بٹ کو گرفتار کیا جاتا ہے جس کے خلاف راشد حسن بٹ کے والد لاہور ہائی کورٹ میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۹۱ کے تحت پیشکش⁶⁷ دائر کرتا ہے اور یوں اس مقدمے کا آغاز ہوتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

کیا کسی ایسے ملزم کو، جس کے حق میں مجاز عدالت کی جانب سے کسی فوجداری مقدمے میں ضمانت منظور ہو گئی ہو، اسی مقدمے میں نئے جرائم کے اضافے کی آڑ میں گرفتار کیا جا سکتا ہے؟

عدالت کا استدلال:

عدالت قرار دیتی ہے کہ اس صورت حال میں پروسیجر سے متعلق دو نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں:

⁶⁵ اہم فیصلہ لاہور ہائی کورٹ کے معزز جج علی ضیاء ہاجوہ نے لکھا ہے، اور اس کو بحوالہ "اپنی ایل جے ۲۰۲۳

سی آر۔ سی لاہور" لاہور ہائی کورٹ کی ویب سائٹ پر ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

⁶⁶ ٹیم ممبر آئین و قانون طالب العلم، الشریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

⁶⁷ Habeous Corpus.

پہلا یہ کہ؛ اس صورت میں ملزم پر لازم ہے کہ وہ اضافہ شدہ جرائم سے متعلق الگ سے ضمانت کے لئے عدالت سے درخواست کریں۔ کیونکہ اس نقطہ نظر کے مطابق ہر جرم اپنی ایک الگ اور جداگانہ خاصیت رکھتا ہے اور ہر ایک جرم الگ طور پر ملزم کی شخصی آزادی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یعنی کہ مقدمے میں اضافہ شدہ جرائم کی بنیاد پر پولیس اس ملزم، جس کو عدالت کی جانب سے ضمانت پر پہلے ہی رہا کیا جا چکا ہو، کو گرفتار کر سکتی ہے کیونکہ بعد میں اضافہ شدہ جرائم، اس ملزم کی شخصی آزادی پر اپنے طور الگ سے اثر انداز ہوتے ہیں اور ملزم کے حق میں پہلے سے منظور شدہ ضمانت کا اطلاق ان بعد میں اضافہ شدہ جرائم پر نہیں ہوتا۔

دوسرا یہ کہ؛ یہ استغناش کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضمانت کی منسوخی کے لئے عدالت سے رجوع کرے اور عدالت پر یہ واضح کرے کہ اس خاص صورت حال میں ضمانت کا منسوخ ہونا لازمی ہے۔

اس کے بعد معزز عدالت پنجاب پولیس رولز ۱۹۳۴ کا رول نمبر ۲۶-۲۱[۶] نقل کرتی ہے جو کہ کچھ یوں کہتا ہے کہ؛

کسی بھی پولیس افسر کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم، جس کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۲۹۷ کے تحت ضمانت پر رہا کیا گیا ہو، کو دوبارہ گرفتار کر سکے۔ جب دوبارہ گرفتاری ضروری سمجھی جائے تو پولیس پر لازم ہے کہ وہ، ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۲۹۷[۵] کے مطابق ضمانتی پھلکے کی منسوخی اور وارنٹ جاری کرنے کے لیے مجاز عدالت میں درخواست دے۔

مندرجہ بالا بحث کو ذہن میں رکھتے ہوئے عدالت نے یہ قرار دیا کہ قانونی صورت حال یہ بنتی ہے کہ ایک بار جب کسی ملزم کو ضمانت مل جاتی ہے، تو اسے تفتیشی ایجنسی کسی بھی صورت گرفتار نہیں کر سکتی الا یہ کہ تفتیشی ایجنسی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۲۹۷[۵] کے تحت ضمانت کی منسوخی کے لئے مجاز عدالت میں درخواست دائر کر دے اور وہ عدالت ملزم کی ضمانت منسوخ کر دے۔

مذکورہ رول نمبر ۲۹-۲۱[۶] بھی یہ لازم قرار دیتا ہے کہ ایسی کوئی بھی کارروائی عدالت کی صریح اجازت کے بعد کی جانی چاہیے تاکہ "عدالتی نگرانی" اور "ملزم کے حقوق کی حفاظت" کو یقینی بنایا جا سکے۔

لاء آفیسر کی جانب سے ایک اعتراض یہ سامنے آجاتا ہے کہ مذکورہ رول کا اطلاق " ضمانت قبل از گرفتاری " پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق " ضمانت بعد از گرفتاری " پر ہوتا ہے۔ لیکن معزز عدالت، ملک میں قانون ضمانت کا تجزیہ اور اس کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالنے کے بعد اس اعتراض کو رد کرتی ہے اور یہ قرار دیتی ہے کہ اس اصول کا اطلاق ہر دو صورتوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس اصول کے اطلاق کو صرف " ضمانت بعد از گرفتاری " تک محدود کرنا انصاف کے اصولوں اور آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر مٹج ہوگی۔ پس مدعی کی یہ گرفتاری مذکورہ رول اور قانونی اصولوں کی صریح خلاف ورزی پر مشتمل ہے۔ فلہذا یہ عدالت ملزم کی گرفتاری کو غیر قانونی قرار دیتی ہے۔

عدالت مزید گہرائی میں جا کر اس نقطے پر بحث کرتے ہوئے قرار دیتی ہے کہ یہ ایک ایسا مقام [یعنی ضمانت پر رہا کردہ ملزم کو دوبارہ گرفتار کرنا/ نہ کرنا] ہے جہاں " ملزم کے حقوق " اور " انصاف کے تقاضے " پیچیدہ طور پر باہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ لہذا اس مقام پر ان امور کا عدالتی نگرانی کے ماتحت ہونا لازمی اور ناگزیر ہے۔

پولیس کو یہ اختیار دینا کہ وہ ضمانت پر رہا کردہ کسی ملزم کو صرف اس بنیاد پر گرفتار کر سکتے کہ اس کے مقدمے میں اس کے خلاف کچھ مزید جرائم عائد کئے گئے ہیں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو غیر محدود اختیار اور کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہوگا۔ جس کے آڑ میں وہ آسانی کے ساتھ عدالتی حکمنامے کو جھانسا دے سکیں گے۔ اور اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد [بشمول ملزم] کی آزادی، جو کہ افراد کا ایک آئینی حق ہے، استغاثہ کے رحم و کرم پر ہوگا۔ لہذا اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

کیا فوجداری مقدمات مختار نامے کے ذریعے سے چلائے جا سکتے ہیں؟ اس قضیے پر اسلام آباد

ہائی کورٹ کا فیصلہ⁶⁸

فرقان احمد⁶⁹



کیس کے حقائق:

گلنراز احمد [شکایت دہندہ] نے خاور محمود [ایہیل کنندہ] کے خلاف زیر دفعہ ۵، ۴، ۳ اور ۷ غیر قانونی بے دخلی ایکٹ ۲۰۰۵ء، استغاثہ دائر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد کے سیکر آئی نائین میں موجود اسکی بہن [جو کہ برطانیہ میں مقیم ہے] کا ایک پلاٹ جو کہ بغرض رکھوالی ایہیل کنندہ کے حوالے کیا گیا تھا، اس میں ایہیل کنندہ نے بغیر اجازت ہوٹل کھول لیا ہے، جس پہ پلاٹ ریاض خان کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد ازاں شکایت دہندہ کے علم میں یہ بات آئی کہ ایہیل کنندہ نے جعلی بیع نامہ تشکیل دے کر شکایت دہندہ کے جعلی نشان اگوتھا بھی لگا لیے ہیں۔ مزید براں ایہیل کنندہ بجلی کا میٹر بھی اپنے نام کروا کر خود کو پلاٹ کا مالک ظاہر کر رہا ہے۔ استغاثہ دائر ہونے کے بعد قانونی کاروائی عمل میں لائی گئی اور سیشن عدالت نے ایہیل کنندہ کو بے دخلی قانون کی دفعہ ۳ کے تحت ۳ سال قید با مشقت اور ۲۰ ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی۔

خاور محمود [ایہیل کنندہ] نے سیشن جج صاحب کے اس فیصلے کے خلاف اسلام آباد ہائی کورٹ میں ایہیل دائر کی جو سماعت کیلیے جسٹس طارق محمود جہانگیری صاحب کے پاس مقرر ہوئی۔ جسٹس جہانگیری صاحب نے دفعہ ۳، غیر قانونی بے دخلی ایکٹ ۲۰۰۵ء کی تشریح کرتے ہوئے جرم کیلیے درج ذیل اجزاء کو ضروری قرار دیا ہے۔

⁶⁸ اس کیس کو حوالہ ”دہ کریمنیل ایہیل نمبر ۴۴ آف ۲۰۲۳“ کے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁶⁹ ممبر ٹیم آئین و قانون۔

- i. ملزم کسی جائیداد میں داخل ہو۔
- ii. ملزم اس دخول کا مجاز نہ ہو۔
- iii. ملزم کی نیت جائیداد کے مالک کو بے دخل کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کی ہو۔
- iv. جائیداد کا مالک اس پر قابض ہو۔

عدالت نے کہا کہ اس کیس میں دفعہ ۳ کے اجزاء مکمل نہیں ہوتے اور یہ مشہور قضیہ ہے کہ جب تک کسی جرم کے تمام اجزاء پورے نہ ہوں، وہ جرم سرزد نہیں ہوتا۔ چونکہ اپیل کنندہ پلاٹ میں مالک کی اجازت بلکہ حکم پہ داخل ہوا تھا، اس لیے وہ اس دخول کا مجاز تھا۔ ویسے بھی شکایت دہندہ نہ ہی اس جائیداد کا مالک تھا اور نہ ہی جائیداد اسکے قبضے میں تھی۔ جہاں تک جعلی دستاویزات کی تیاری کا تعلق ہے، تو اس بابت الگ مقدمہ درج ہے اور ملزم/اپیل کنندہ زیر حراست ہے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ نے اپیل کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے خاور محمود کو سیشن کورٹ کی دی گئی سزا سے بری کر دیا۔

کیس کے دوران عدالت کی جانب سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ درخواست دہندہ نہ تو جلداد کا مالک ہے اور نہ ہی مظلوم/ستم رسیدہ ہے، بلکہ وہ تو اپنی بہن کی جانب سے اس جائیداد کا مختار ہے، فوجداری معاملات میں مختار نامے کی بنیاد پہ مقدمہ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟

عدالت نے کہا کہ فوجداری مقدمات میں مختار نامے کی بنیاد پہ کارروائی عمل میں نہیں لائی جاسکتی کیونکہ فوجداری نظام انصاف صرف ان لوگوں کو شکایت اور گواہی کا اہل قرار دیتا ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جرم ہوتا دیکھا ہو یا اپنے کانوں سے جرم کے متعلق سنا ہو۔ چونکہ مختار اس کسوٹی پہ پورا نہیں اترتا، اس لیے وہ گواہ یا شکایت دہندہ بننے کا اہل نہ ہے۔ پس مختار اس حیثیت میں ایف آئی آر درج نہیں کروا سکتا ہے اور نہ ہی قانون میں ایسی کوئی رعایت موجود ہے۔

جسٹس جہانگیری صاحب نے مزید کہا کہ نہ ہی مختار نامے کی بنیاد پہ کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے اور اس کیس میں نہ ہی شکایت دہندہ کی طرف سے مختار نامہ پیش کیا گیا ہے۔ ایسی صورتحال

میں شکایت دہندہ کی حیثیت فقط ایک اجنبی کی ہے اور اسکا کوئی "70 لوکس سٹینڈائی" نہیں ہے۔ عدالت نے درج ذیل سابقہ فیصلوں⁷¹، کو مد نظر رکھا ہے۔

ملازم کے حق ضمانت کو ضمانتی چٹکوں کے علاوہ دیگر شرائط کے ساتھ مشروط کرنے کے حوالے سے سپریم

کورٹ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ⁷²

محمد ذوالقرنین⁷³



حقوق اور فیصلے کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ کیس اس لحاظ سے انتہائی اہم اور تاریخ ساز ہے کہ اس میں عدالت عظمیٰ نے اس اہم سوال اور قضیے کو حل کیا ہے کہ کیا جب کوئی عدالت کسی ملازم کو ضمانت کا حقدار سمجھ کر اس کو ضمانت دینے کا فیصلہ کرتی ہے تو کیا ملازم کے اس حق کو ضمانتین کی جانب سے جمع کرائے جانے والے ضمانتی چٹکوں کے ساتھ ساتھ کسی اور شرط کے ساتھ مشروط کر سکتی ہے یا نہیں۔

کیس کے حقائق:

⁷⁰ Locus Standi

⁷¹ 2021 PCr.LJ Note 66 [Sindh], 2016 MLD 1238, 2017 PCr.L.J

1104, PLD 2011 Lahore 179, PLD 2008 Karachi 342.

⁷² یاد رہے کہ یہ انتہائی اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے سینئر جج، جسٹس سردار طارق مسعود صاحب نے لکھا ہے اور ان کے ساتھ جسٹس امین الدین خان اور جسٹس محمد علی مظہر صاحب نے اتفاق کیا ہے۔ اس فیصلے کو "۲۰۲۳ ایس سی ایم آر صفحہ ۴۰۱" کے طور پر پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

⁷³ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

جاوید اقبال نامی ملزم کے خلاف ۱۹ ستمبر، ۲۰۱۹ کو ایف آئی اے پولیس سٹیشن میں "پرویشن آف الیکٹرانک کرائم ایکٹ، ۲۰۱۶" 74 کے دفعہ ۱۳، ۱۴ اور مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۲۲۰، ۲۶۸، ۲۷۱ اور ۱۰۹ کے تحت ایک ایف آئی آر کا اندراج کیا گیا جس کے نتیجے میں ملزم کو حراست باقاعدہ طور پر حراست میں لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد ملزم کی جانب سے پرویشن آف الیکٹرانک کرائم ایکٹ کے تحت قائم خصوصی عدالت سے ضمانت بعد از گرفتاری کے لئے رجوع کیا لیکن خصوصی عدالت نے ملزم کی درخواست ضمانت مسترد کر دی جس کے بعد ملزم نے عدالت عالیہ اسلام آباد سے رجوع کیا جس کو عدالت عالیہ نے ۵ لاکھ روپے کے ضمانتی چیکوں کے ساتھ منظور کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ عدالت نے ملزم کو اس بات کا بھی پابند بنایا کہ وہ ٹرائل کورٹ میں پینتیس لاکھ روپے جمع کرے۔ عدالت کی جانب سے ملزم کو ضمانت تو مل گئی لیکن ۳۵ لاکھ روپے ٹرائل کورٹ میں جمع کرنے والے شرط کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ملزم کی رہائی تا حال ممکن نہیں ہو سکی تھی تو اس لئے ملزم نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ سپریم کورٹ میں ملزم کے وکیل کی جانب سے یہ دلائل دئے گئے کہ قانون کی رو سے ضمانت کے فیصلے میں عدالت ضمانتی چیکوں کے علاوہ کوئی اور شرط مسلط نہیں کر سکتی اور ساتھ ہی ساتھ وکیل کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ عدالت عالیہ نے یہ بات فرض کی ہے کہ ملزم نے ۳۵ لاکھ روپے قبول کیے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس اس وجہ سے ہے کہ ملزم نے ۳۵ لاکھ روپے قبول نہیں بلکہ تردید کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عدالت عالیہ کے فیصلے میں موجود اس پیرا گراف پر بھی انحصار کیا ہے کہ جس کے مطابق باقی تمام سوالات ٹرائل کے دوران شہادت کے بعد ہی واضح ہو سکیں گے اور اپنے دلائل کے حوالے سے ملزم کے وکیل نے اعلیٰ عدالتوں کے عدالتی نظائر پر بھی انحصار کیا ہے جبکہ دوسری طرف ریاست کی جانب سے ڈپٹی ایٹارنی جنرل نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ قانون کی رو سے ضمانت کے حکم میں ایسا کوئی شرط غیر قانونی تصور ہوتا ہے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

کیا جب کوئی عدالت کسی ملزم کو ضمانت کا حقدار سمجھ کر اس کو ضمانت دینے کا فیصلہ کرتی ہے تو کیا ملزم کے اس حق کو ضمانتین کی جانب سے جمع کرائے جانے والے ضمانتی چیکوں کے ساتھ ساتھ کسی اور شرط کے ساتھ مشروط کر سکتی ہے یا نہیں؟۔

عدالت کا استدلال:

⁷⁴Prevention of Electronic Crimes Act, 2016.

مندرجہ بالا قضیے کے حل کے لئے عدالت نے اپنی بحث کا آغاز مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۹۹ سے کیا ہے کہ عدالت جب مستقبل میں ملزم کی حاضری کا بندوبست یا انتظام کرتی ہے تو عدالت کی جانب سے ملزم سے یا تو خود شخصی ضمانت پر اور یا پھر دیگر افراد کی جانب ضمانتی پھلکے جمع کرائے جاتے ہیں اور اگر ملزم بعد میں عدالت میں پیش نہیں ہوتا تو عدالت اس کے چنگلوں کو مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۵۱۴ کے تحت ضبط کر لیتی ہے۔ یہاں پر عدالت نے صراحت کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ اگر کوئی عدالت اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ ملزم ضمانت کا حقدار ہے تو ایسی صورت میں ضمانت کے حکم کو دیگر شرائط کے ساتھ مشروط نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں پر عدالت نے ضمانت کی تعریف بھی کی ہے کہ ضمانت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک ملزم کو سرکاری اہلکاران یا جوڈیشل لاک اپ سے رہا کر کے اس کو ضمانتی چنگلوں کے عوض کسی ضامن کے حوالے کرنا ضمانت کہلاتا ہے اور ضامن اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ اس کو جب عدالت کہے تو عدالت میں پیش کرے۔ یہاں پر عدالت نے صراحت کے ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ عدالت ۱۹۹۳ سے لے کر آج تک اس بات کی حوصلہ شکنی کرتی رہی ہے کہ ملزم کے حق ضمانت کو کسی اور شرط کے ساتھ مشروط کیا جائے کیونکہ قانون اور ضابطہ فوجداری کے مطابق ملزم کی رہائی کے لئے ضمانتی پھلکے کافی ہیں۔ عدالت نے یہاں پر مشہور زمانہ عدالتی نظیر میاں محمود علی قصوری بنام سرکار پر انحصار کیا ہے۔ عدالت نے اس کے بعد عدالت عظمیٰ کے ہی ایک اور عدالتی نظیر فیض الرحمن سرکار بنام سرکار پر انحصار کر کے یہ بات لکھی ہے کہ عدالت ضمانت کے حکم میں دیگر شرائط تو درکنار حتیٰ کہ یہ شرط بھی نہیں عائد کر سکتی کہ ملزم آئندہ یہ جرم نہیں کرے گا۔ عدالت نے یہاں پر ایک اور انتہائی اہم اصول کو بھی ذکر کیا ہے کہ ضمانت کے فیصلے کو جرمانے کے رقم کی وصولی کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ عدالت نے اس ضمن میں مزید عدالتی نظائر پر بھی انحصار کر کے تمام عدالتی نظائر کا خلاصہ کچھ یوں نکالا ہے کہ :

1. مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۹۹ کے تحت عدالت کسی ملزم کو ضمانت دیتے ہوئے اس بات کا پابند نہیں بناسکتی کہ ملزم کوئی ایسا اقرار نامہ جمع کرے کہ وہ آئندہ ایسا کوئی جرم نہیں کرے گا یا وہ آئندہ جرائم سے توبہ تائب یا باز آئے گا اور ایسا کوئی شرط نہ تو ضمانت کے حکم اور نہ ہی پھلکے میں عائد کی جاسکتی ہے۔

2. اگر ملزم کو ضمانت، ضمانت کے لئے اہل یا حقدار ہونے یعنی میرٹ پر مبنی ہو تو پھر ایسے فیصلے کو جرمانے کے رقم کی وصولی کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا اور ایسا کوئی شرط عائد کرنا اس کی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہوگا۔
3. ملزم کے حق ضمانت کو دیگر شرائط کے ساتھ مشروط نہیں کیا جاسکتا اگر وہ ضمانت کے لئے اہل یا ضمانت کا حقدار ہو۔
4. ضمانت کے فیصلے میں ضمانتی مچلکوں کے علاوہ اور شرط رکھنا اس بات کا عکاس ہوگا کہ وہ عدالت، عدالت عظمیٰ کے نظائر کی نفی کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا اصول و ضوابط وضع کرنے کے بعد عدالت اس کیس کی طرف واپس آئی ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ عدالت عالیہ کی جانب سے ملزم کے حق ضمانت کو ضمانتی مچلکوں کے علاوہ ۳۵ لاکھ روپے جمع کرانے سے مشروط کرنا غیر قانونی ہے بدین وجہ عدالت نے ۳۵ لاکھ روپے جمع کرنے والی شرط کو کالعدم قرار دیتے ہوئے ملزم کو ۵ لاکھ روپے کے ضمانتی مچلکوں کے عوض ضمانت کا حقدار قرار دے دیا۔

خلاصہ:

اس انتہائی اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی ملزم کو عدالت ضمانت کا حقدار تصور کرے تو عدالت کی جانب ملزم کے اس حق کو ضمانتین کی جانب سے جمع کرائے جانے والے ضمانتی مچلکوں کے علاوہ دیگر شرائط کے ساتھ مشروط کرنا غیر قانونی ہوگا۔

عائلی مقدمات

جمع بین الاختین یعنی دو سگی بہنوں کو ایک ہی ساتھ نکاح میں رکھنے کے کیس میں

ملازم کی ضمانت کے حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁷⁵

محمد ذوالقرنین⁷⁶



بنیادی سوالات:

1. کیا ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھا جا سکتا ہے؟
2. کیا کسی ایسی مطلقہ بیوی جب کہ وہ ابھی عدت میں ہو تو اس کی بہن یعنی سالی کے ساتھ نکاح کی گنجائش ہے؟

کیس کے حقائق:

۱۱ اگست ۲۰۲۳ کو ضلع شیونپورہ کے تھانہ صدر میں صابر علی نامی شکایت کنندہ کچھ یوں رپورٹ کرتا ہے کہ اس کی بہن حمیرا بی بی کی شادی آج سے نو سال پہلے مصور حسین نامی شہری کے ساتھ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ان کے دو بچے بھی ہیں لیکن ۳۰ جولائی ۲۰۲۳ کو مصور حسین یعنی میرا بہنوئی، میری چھوٹی بہن سمیرا بی بی بھرا اٹھارہ سال کو زیادتی اور زبردستی شادی کی غرض سے اغوا کر لیتا ہے جس پر پولیس کی جانب سے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۶۵-بی کے تحت مصور حسین کے خلاف مقدمہ درج کر دیا جاتا ہے۔ شکایت کنندہ یعنی صابر علی کے بقول مصور حسین کی دوسری شادی نہ صرف غیر قانونی ہے بلکہ شریعت کے بھی منافی ہے کیونکہ

⁷⁵ یہ اہم فیصلہ عدالت عالیہ لاہور کے جسٹس طارق سلیم شیخ صاحب نے لکھا ہے جس کو "کریمنل پیٹیشن

نمبر ۳۲۸-بی-۶۷-آف ۲۰۲۳" پر پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

⁷⁶ وکیل عدالت عالیہ پشاور و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

شریعت کے مطابق ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کو ایک ہی وقت میں نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ دوسری طرف ملزم مصور حسین کے مطابق اس نے کوئی جرم نہیں سرزد نہیں کیا کیونکہ اس کے مطابق اس نے ۱۰ جولائی کو حمیرا بی بی کو طلاق دی جبکہ ۷ جولائی کو اس نے حمیرا کے ساتھ نکاح کیا ہے اور دوران تفتیش اس نے نہ صرف نکاح نامے بلکہ طلاق کے متعلق بھی کاغذات مہیا کئے۔

پہلا سوال:

کیا ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھا جا سکتا ہے؟ عدالت نے اس سوال کے جواب میں اپنے تفصیلی بحث کا آغاز نکاح کی تعریف اور حقیقت سے کیا ہے اور اس ضمن میں یہ قرار دیا ہے کہ نکاح نہ صرف ایک سماجی بلکہ مقدس معاہدہ بھی ہے۔ اس کے بعد عدالت نے غیر ازدواجی تعلقات کی حرمت پر اسلامی نکتہ نظر سے ایک خوبصورت بحث باندھی ہے اور اس کو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف قرار دیا ہے۔ نکاح کی تعریف، حقیقت اور اہمیت کے بعد عدالت نے محرمات کا رخ کیا ہے اور اس حوالے سے لاہور ہائی کورٹ کے مشہور زمانہ فیصلے افتخار نذیر خان کیس کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ تقریباً انیس اقسام کی عورتیں محرمات میں شمار ہوتی ہیں یعنی وہ ایسی عورتیں ہیں جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ محرمات کے بعد عدالت نے محرمات کی دونوں اقسام یعنی عارضی محرمات [غیر مؤبد [اور ابدی [مؤبد] محرمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور غیر مؤبد کی اقسام میں باقی اقسام کے علاوہ دو بہنوں کو بیک وقت میں جمع کرنا بھی زکر کیا ہے۔

مؤبد اور غیر مؤبد محرمات کی وضاحت کے بعد عدالت نے نکاح کے حکم یعنی صحیح، فاسد اور باطل پر پر ایک نہایت ہی خوبصورت پیرا گراف لکھا ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ اسلامی اصطلاحات کو ہمیشہ اصل حالت میں ہی لکھنا چاہیے کیونکہ اصطلاحات کے ترجمے سے اصلی مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو کہ اکثر اوقات غلط فہمی کو جنم دیتا ہے۔ یہاں پر عدالت نے صراحت کے ساتھ یہ قرار دیا ہے کہ " فاسد " کو " irregular " کے ساتھ مشابہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کے بعد عدالت نے نکاح صحیح، فاسد اور باطل کا جائزہ ان کے احکامات اور نتائج کی روشنی میں لیا ہے جو کہ یقیناً ایک لمبے بحث کا متقاضی ہے۔ فاسد نکاح کے حوالے سے فیصلے میں تفصیلی بحث کی

گئی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ خلوت صحیحہ کے بغیر فاسد نکاح میں نہ تو مہر لازمی ہے اور نہ ہی عدت لیکن اگر خلوت صحیحہ وقوع پذیر ہو تو پھر نہ صرف مہر لازمی ہوتا ہے بلکہ عدت کا گزارنا بھی لازم ہوتا ہے لیکن فاسد نکاح کرنے پر احکام زنا لاگو نہیں ہوتے لیکن تعزیری سزا پھر بھی ممکن ہے۔ فاسد نکاح کرنے کی صورت میں جب فساد معلوم ہو جائے تو فوراً علیحدگی اختیار کرنی چاہیے اور اگر فریقین پھر بھی علیحدہ نہیں ہوتے تو پھر قاضی کو چاہیے کہ نہ صرف ان کو الگ کرے بلکہ تنفیخ نکاح بھی کرے۔ یہاں پر عدالت نے نہ صرف ہدایہ، کنز الدقائق، وقایہ اور محضن لا کا حوالہ بھی دیا ہے۔

اس انتہائی اہم بحث کا خلاصہ عدالت نے کچھ یوں نکالا ہے کہ ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھنا حرام ہے لیکن اس میں اختلاف یہاں پر ہے کہ کیا یہ باطل کے حکم میں آئے گا یا پھر فاسد کے دائرہ کار میں تو اس حوالے سے عدالت نے لکھا ہے کہ جمہور کی رائے میں یہ فاسد شمار ہوگا اور اس کے لئے عدالت نے سید امیر علی پر انحصار کیا ہے اور یہاں پر یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے میں دو سگی بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے پر زنا کے احکام تو لاگو نہیں ہو سکتے لیکن اس کی حرمت کو دیکھتے ہوئے تعزیری سزا دینا لازمی ہے۔

دوسرا سوال:

کیا کسی ایسی مطلقہ بیوی جب کہ وہ ابھی عدت میں ہو تو اس کی بہن یعنی سالی کے ساتھ نکاح کی گنجائش ہے؟

اس سوال کا جواب عدالت نے طلاق اور اقسام طلاق سے کیا ہے جن میں طلاق احسن، حسن اور بدعی کا ذکر عدالت نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ طلاق تب تک تکمیل تک نہیں پہنچتی جب تک عدت مکمل نہ ہو جائے اور اس ضمن میں عدالت نے وفاقی شرعی عدالت کے مشہور زمانہ فیصلے محمد عارف بنام ریاست کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

عدالت اس کے بعد موجودہ کیس کی طرف واپس آئی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ مصور پر الزام یہ ہے کہ اس نے بیک وقت دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھا ہے جس کے جواب میں ملزم کا کہنا ہے کہ اس نے اس پہلے حمیرا کو طلاق دی ہے اور اس کے بعد سمیرا کے ساتھ نکاح کیا

ہے لیکن چونکہ دوسرا نکاح عدت ختم ہونے سے پہلے ہوا ہے تو اس لئے یہ فاسد ہے اور اس پر فوجداری سزا تعزیر کی شکل میں لاگو ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ یہاں پر ایک دلچسپ معاملہ تب آیا جب دوران تفتیش ملزم نے طلاق کی بابت سٹامپ پیپر جمع کرایا جو کہ تفتیش کے دوران جعلی ثابت ہوا تو پولیس نے ایف آئی آر میں دھوکہ دہی وغیرہ کے دفعات بھی شامل کئے۔ یاد رہے کہ ایک تفصیلی بحث کے بعد عدالت نے ملزم کی درخواست ضمانت کو خارج کر دیا۔

عائلی عدالتوں کی جانب سے تنسیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کو تنسیخ نکاح بزریہ خلع میں

تبدیل کرنے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک نہایت ہی اہم فیصلہ⁷⁷

محمد ذوالقرنین⁷⁸



کیس کے حقائق:

۷ اگست ۲۰۱۴ کو صائمہ نامی ایک عورت نے ایبٹ آباد کی مقامی عائلی عدالت یعنی فیملی کورٹ میں ابراہیم خان نامی ایک شہری کے خلاف مندرجہ ذیل دو کیسز جمع کیے:

1. تکذیب نکاح یعنی کہ ابراہیم خان، صائمہ کا شوہر ہونے کا جھوٹا دعویٰ ہے اور اگر

یہ بات ثابت نہیں ہو پاتی تو متبادل کے طور پر تنسیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کا فیصلہ

اور اس کے ساتھ ساتھ سامان جہیز اور مہر کے دلاپانے کا دعویٰ۔

⁷⁷ یہ اہم فیصلہ جسٹس عائشہ ملک صاحبہ نے لکھا ہے جن کے ساتھ بیچ میں موجود جسٹس یحییٰ آفریدی صاحب اور جسٹس امین الدین خان نے اتفاق کیا ہے اور اس فیصلہ کو "پی ایل ڈی ۲۰۲۳ سپریم کورٹ صفحہ ۶۳۵" پر پڑھا جا سکتا ہے۔

⁷⁸ شریک بانی آئین و قانون۔

2. دوسرا دعویٰ صائمہ کی طرف سے یہ دائر کیا گیا کہ اس کو نان نفقہ دیا جائے اور متبادل کے طور پر مکان کا قبضہ یا اس کی موجودہ بازاری قیمت اس کو ادا کی جائے۔ یاد رہے کہ صائمہ کی جانب سے مندرجہ بالا دونوں کیسز کے جواب میں نہ صرف جواب دعویٰ جمع کرایا جاتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ دعویٰ اعادہ حقوق زن و شوئی بھی جمع کرایا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں کیسز کا فیصلہ فیملی کورٹ کی جانب سے ۲۶ نومبر ۲۰۱۵ کو کیا جاتا ہے جس کے مطابق عدالت نے نہ صرف صائمہ کو تنفیخ نکاح بزریہ خلع بشرط معافی مہر کا فیصلہ بلکہ ساتھ ہی ساتھ نان نفقہ بشمول عدت کے دورانیے اور سامان جہیز بھی واپس کرنے کا فیصلہ دے دیتی ہے جبکہ دوسری طرف شوہر کی جانب سے کیے جانے والے دعویٰ اعادہ حقوق زن و شوئی کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ عائلی عدالت کے اس فیصلے کو ضلعی عدالت کی جانب سے بھی اپیل کے موقع پر برقرار رکھا جاتا ہے لیکن خاتون کے نان نفقہ کی رقم میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ صائمہ کی جانب سے اس فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ سے بدیں وجہ رجوع کیا جاتا ہے کہ اس نے کیس میں کہیں پر بھی خلع کی استدعا نہیں کی بلکہ اس کا دعویٰ تو تنفیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی تھا۔ عدالت عالیہ نے دونوں فریقین کے دلائل سننے کے بعد نچلی دونوں عدالتوں یعنی عائلی جج اور ضلعی جج کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ چونکہ اس کیس میں تو ابراہیم خان پہلے ہی صائمہ کو طلاق دے چکا ہوتا ہے تو پھر خلع کی ضرورت کہاں سے آگئی اور اسی وجہ سے عدالت نے ابراہیم خان کو حکم دیا کہ وہ صائمہ کو حق مہر ادا کرے۔

عدالت عالیہ کے اس فیصلے کے خلاف ابراہیم خان نے عدالت عظمیٰ سے اس لئے رجوع کیا کہ نہ صرف فیملی کورٹ بلکہ ضلعی عدالت کا فیصلہ اس لئے درست تھا کیونکہ صائمہ، میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی تو اس لئے عدالت نے اس کو خلع دیا اور دوسرا چونکہ ابراہیم کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے صائمہ کو طلاق نہیں دی تو اس لئے صائمہ مہر کی حقدار نہیں ہے۔

سپریم کورٹ نے اپنے سامنے فیصلے کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک اہم سوال رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کیس میں اصل تنازعہ یہ ہے کہ کیا شوہر نے طلاق دی ہے یا نہیں لیکن شوہر یعنی ابراہیم کی خیال میں عدالت کی جانب سے خلع دینا درست ہے لیکن اس کی جانب سے طلاق دینا تنازعہ ہے تو اس لئے عدالت نے اپنے سامنے مسئلہ صرف یہ رکھا ہے کہ کیا جب ایک کیس

میں عورت کی جانب سے تنسیخ نکاح بزریعہ ظلم و زیادتی مانگی ہو تو کیا عدالت عورت کے اس استدعا کو تنسیخ نکاح بزریعہ خلع میں خود سے تبدیل کر سکتی ہے اور خاص کر جب عورت نے خلع مانگی ہی نہ ہو۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ:

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا آغاز محمدن لا کے پیراگراف نمبر ۳۱۹ {۲} سے کیا ہے جس کے مطابق خلع بنیادی طور پر میاں بیوی کے درمیان ایک لین دین ہے جس کی ابتداء بیوی کی جانب سے ہوتی ہے جس میں وہ شوہر کو اس کو آزاد کرنے کی خاطر معاوضہ آفر کرتی ہے تو جس کو اگر شوہر تسلیم کرتا ہے تو یہ طلاق بزریعہ خلع کہلائے گا جو کہ ایک طلاق بانئن کے برابر ہے۔ مندرجہ بالا تمہید کے بعد عدالت نے خلع کی تاریخ پر مشتمل ایک خوبصورت بحث مرتب کیا ہے جس کا آغاز عدالت نے مشہور زمانہ فیصلے خورشید بی بی بنام بابو محمد امین سے کیا ہے جب کہ اختتام وفاقی شرعی عدالت کے حال ہی میں آنے والے فیصلے حاجی سیف الرحمان کیس پر کیا ہے۔ اس پیراگراف کا خلاصہ یہ ہے کہ خلع عورت کا ایک ایسا بنیادی حق ہے کہ جس کے حصول کے لئے عورت کا کوئی وجہ بتانا ضروری نہیں ہے بلکہ عورت کا صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور عدالت عورت کو خلع شوہر کی بغیر کسی غلطی کے بھی دے سکتی ہے۔

خلع پر ایک طویل بحث کے بعد عدالت نے تنسیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کا رخ کیا ہے اور اس ضمن میں عدالت نے ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ انیس سو انتالیس کی تاریخ و مقصد پر ایک لمبی بحث لکھی ہے۔ عدالت نے مختلف کتب و آرٹیکلز کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس ایکٹ کو معرض وجود میں لانے کے پیچھے ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حنفی فقہاء کے نزدیک خلع میں بھی شوہر کی رضامندی لازمی ہے تو یہ بات کولوئیل دور کے قانون دانوں کو قدرتی انصاف کے اصولوں کے خلاف لگ رہی تھی تو مندرجہ بالا باتوں کو دیکھتے ہوئے اس ایکٹ کا قیام انیس سو چھتیس میں عمل میں لایا گیا۔

ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ اور خلع کے حوالے سے بحث پر مشتمل پیراگراف کا نتیجہ عدالت نے یہ نکالا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل مختلف وہ حقوق ہیں جن کے تحت ایک

عورت اپنی شادی کا اختتام کر سکتی ہے۔ ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ کے تحت تنسیخ نکاح اور خلع کے ذریعے تنسیخ نکاح میں فرق مندرجہ ذیل ہے :

1. ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ کے نیچے جب کوئی عورت عدالت کا رخ کرتی ہے اور عدالت سے کسی گروانڈ [ظلم و زیادتی وغیرہ] کی بناء پر نکاح کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کو فسخ کہا جاتا ہے جب کہ دوسری طرف خلع کے لئے کوئی بھی وجہ ضروری نہیں ہے۔

2. ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ کے تحت تنسیخ نکاح کے لئے عورت کی جانب سے بتائی جانی والی وجہ کو جب عورت ثابت کر لیتی ہے تو عورت کا حق مہر برقرار رہتا ہے جب کہ خلع کی صورت میں عورت کو اپنا حق مہر معاف کرنا پڑتا ہے۔

3. خلع کی صورت میں فریقین کے درمیان ابتدائی ثالثی ناکام ہونے کے بعد عدالت پر لازمی ہے کہ وہ فوراً بیوی کو خلع کی ڈگری دے جب کہ ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ کے تحت فیصلہ صرف تب دیا جا سکتا ہے جب شہادت مکمل ہو جائے۔

خلع ، تنسیخ نکاح ، فسخ اور ڈزالوشن آف مسلم میرج ایکٹ پر بحث کے بعد عدالت اپنے سامنے موجودہ سوال پر آئی ہے اور قرار دیا کہ چونکہ اس کیس میں عورت کی جانب سے تنسیخ نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کا کیس تھا اور یہ بات ریکارڈ سے بھی صاف ظاہر ہے تو چونکہ خلع کے حوالے سے مندرجہ بالا بحث کے بعد اب ظاہر ہے کہ عدالت خلع تب تک خلع نہیں دے سکتی جب تک عورت خود صراحت کے ساتھ خلع کا مطالبہ نہ کرے تو اس لئے عائلی عدالت اور ضلعی جج کی جانب سے خلع کا فیصلہ دینا غلط تھا۔

یہ ایک انتہائی اہم مسئلہ حل کرنے کے بعد عدالت نے اپنے سامنے موجود دوسرے مسئلے کا رخ کیا ہے کہ کیا ابراہیم خان ، صائمہ کو طلاق دے چکا تھا یا نہیں تو اس بابت عدالت نے صائمہ کی جانب سے اٹھائے جانے والے اس نکتے کو تسلیم کیا ہے کہ ابراہیم خان نے اسے نہ صرف پولیس تھانے میں طلاق دی تھی بلکہ جرگہ کے سامنے بھی طلاق دی تھی جس کے گواہ بھی موجود ہیں اور انھوں نے شہادت کے موقع پر گواہی بھی دی۔ تو اس لئے عدالت نے طلاق کے

معاملے میں عدالت عالیہ کے فیصلے کو درست تسلیم کیا ہے۔ جس کے بعد عدالت نے ابراہیم خان کو حکم دیا کہ وہ صائمہ کو حق مہر کی ادائیگی کرے جو کہ گھر کا آدھا حصہ بنتا ہے۔ اس اہم کیس کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں فاضل جسٹس صاحبہ نے ہمارے استاد محترم ڈاکٹر محمد منیر صاحب کے خلع کے حوالے سے لکھنے گئے آرٹیکل کا جا بجا حوالہ دیا ہے جب کہ ہمارے ایک اور استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر زبیر عباسی صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر شہباز چیمہ صاحب کی مشترکہ کتاب فیملی لاز ان پاکستان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

کیس کا خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ عدالتوں کی جانب سے از خود تفتیح نکاح بوجہ ظلم و زیادتی کے مقدمات کو تفتیح نکاح بوجہ خلع کے مقدمے میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

مدعیہ کا دوہری شہریت کے حامل ہونے کی وجہ سے خلع کی درخواست کی صورت میں
پاکستان کی مقامی عائلی عدالتوں کے اختیار سماعت کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک

اہم فیصلہ⁷⁹

زاہد الرحمن⁸⁰



کیس کے حقائق:

مدعیہ ثمرینہ رشید پاکستان اور امریکہ کی دوہری شہریت رکھتی ہیں۔ جو کہ نیویارک میں سہیل احمد [درخواست گزار] کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق نکاح کرتی ہے اور پانچ ہزار ڈالر بطور حق

⁷⁹ یہ فیصلہ معزز جناب جسٹس سید حسن اظہر رضوی صاحب نے ۲۰ دسمبر ۲۰۲۳ کو تحریر کیا تھا۔ اس کیس کا حوالہ "سال ۲۰۲۳ کی سول پٹیشن نمبر ۴۸۸-۲۰۲۳ کے اور ۴۸۹-۲۰۲۳ کے" ہے۔

⁸⁰ طالب علم، ایل ایل بی شریعہ اینڈ لاء، اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور۔

مہر کے ساتھ اسے رجسٹرڈ کرتا ہے۔ تاہم شادی کے نو ماہ بعد سہیل احمد [درخواست گزار] کا ثمرینہ رشید [مدعیہ] کے ساتھ رویہ سخت اور غیر ذمہ دارانہ ہو جاتا ہے اور وہ پاکستان واپس آتا ہے۔ نتیجتاً میاں بیوی کے درمیان رشتہ خراب ہو جاتا ہے اور ثمرینہ رشید اپنے وکیل مسٹر عبد الجبار کے ذریعے فیملی کورٹ کراچی میں فیملی کیس⁸¹ دائر کرتی ہے۔ مقدمے میں وہ خلع کے ذریعے تنبیخ نکاح اور نان و نفقہ کی استدعا کرتی ہے جس کے جواب میں سہیل احمد [درخواست گزار] درخواست برائے برخاستگی کچھ یوں دائر کرتا ہے کہ مدعیہ ثمرینہ رشید کے مقدمہ کو خارج کر دیا جائے کیونکہ ان کا نکاح امریکہ میں ہوا ہے اور ثمرینہ وہی دعویٰ بھیج سکتی ہے۔ عدالت ۲۷ فروری ۲۰۲۱ء کو سہیل احمد [درخواست گزار] کی درخواست کو رد کرتی ہے جس کے خلاف درخواست گزار آئینی درخواست⁸² سندھ ہائیکورٹ کے سامنے دائر کرتا ہے۔ اس کے بعد عائلی عدالت میں صلح کی کارروائی کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس کارروائی کی ناکامی پر فیملی کورٹ ۱۰ اپریل ۲۰۲۱ کو خلع کے ذریعے نکاح ختم کرنے کا حکم جاری کرتا ہے اور اسی دن ابتدائی حکم نامہ بھی تیار کر دیا جاتا ہے۔ کیس میں دلچسپ موڑ اس وقت آتا ہے جب فیملی عدالت ثمرینہ رشید [مدعیہ] کی درخواست کے بعض حصوں پر ساعت کے لیے تاریخ مقرر کرتی ہے۔ تاہم ثمرینہ رشید اپنے وکیل کے ذریعے ان حصوں کو واپس لینے کی استدعا کرتی ہے اور عدالت نے ان کی درخواست کو منظور کرتی ہے۔ فیملی عدالت کے فیصلے سے نالا ہو کر سہیل احمد [درخواست گزار]، اُس کو ایک اور آئینی درخواست⁸³ کے ذریعے سندھ ہائی کورٹ میں اس حکم کو چیلنج کرتا ہے۔ اس کے بعد سندھ ہائیکورٹ سہیل احمد [درخواست گزار] کے دونوں آئینی درخواستوں کو یکجا کرتی ہے اور ۶ فروری کو دونوں درخواستوں کو مسترد کرتی ہے جس کے خلاف سہیل احمد [درخواست گزار] سپریم کورٹ میں آئین پاکستان کے دفعہ ۱۸۵ [۳] کے تحت مقدمہ درج کرتا ہے اور عدالت عظمیٰ

⁸¹ مقدمہ نمبر ۳۳۱۴ آف ۲۰۱۹

⁸² آئینی درخواست نمبر ایس-۲۶۲ آف ۲۰۲۱

⁸³ آئینی درخواست نمبر ایس-۲۵۷ آف ۲۰۲۱

سے استدعا کرتا ہے کہ سندھ ہائیکورٹ کا فیصلہ غیر قانونی ہے اور فیملی کورٹ کے دائرہ اختیار سے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ لہذا ان کو خارج کر دیا جائے۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ آتا ہے کہ جب اگر مدعیہ/بیوی پاکستان اور امریکہ کی دوسری شہریت کی حامل ہو اور عدالت میں درخواست دائر کرنے کے وقت وہ امریکہ میں رہائش پذیر ہو اور دوسری جانب شوہر پاکستان کا مستقل رہائشی اور شہری ہو تو کیا پاکستان میں فیملی کورٹس اس مقدمے کی سماعت کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

عدالت کا فیصلہ اور استدلال:

اس سوال کے جواب میں عدالت عظمیٰ نے ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس رولز، ۱۹۶۵ کے قاعدہ نمبر ۶ سے استدلال کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں کچھ یوں لکھتے ہیں کہ اس قانون میں مقننہ نے سوچ سمجھ کر لفظ "عام طور پر" (ordinarily) کا استعمال کیا ہے جس کا مستقل رہائش کے معنی سے مختلف مطلب ہے۔ بلیک لاء ڈکشنری [چھٹی ایڈیشن] کے مطابق لفظ "عام" کا مطلب "معمول، عام، آباد، رواج" اور ساتھ ہی ساتھ ڈائری، ایک مشہور قانون دان اپنی کتاب "Conflict of Law" صنف ۹۶ پر "عام طور پر" (ordinarily resides) کی مفہوم کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ قانون کے مطابق یہ ضروری نہیں ہے کہ رہائش پذیر ہونا وقت کے لحاظ سے لمبا ہو۔ یہ چند دن کی رہائش بھی اس کے لئے کافی ہے۔ رہائش کے لئے عرصہ کی لمبائی بذات خود اہم نہیں ہے۔ اس کے ساتھ عدالت بحث کرتی ہے کہ "عام طور پر (Ordinarily)" (reside) اور "بھی دائرہ اختیار رکھتا ہے" ⁸⁴ جیسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قانون سے مقننہ کا ارادہ بیوی کیلئے چیزوں کو آسان بنانا اور اس کی مشکلات کو دور کرنا ہے۔ لہذا اس طرح کے مقدمات کو بیوی کے اختیار کے ساتھ دائر کرنا اور عدالت اس قانون کے مطابق سہولت دینے کی پابند ہے۔ لہذا پاکستان میں فیملی کورٹس کو اس معاملے کو سننے کا اختیار حاصل ہے اور ٹرانس کورٹ نے اسے بجا طور پر صحیح استعمال کیا ہے۔ مقننہ نے فیملی کورٹ میں

84 Shall also have jurisdiction.

مقدمات کی سماعت کے لیے علاقائی دائرہ اختیار کے سخت اصول میں نرمی کرتے ہوئے عورت کو اجازت دیتی ہے کہ وہ شادی کی تحلیل یا مہر کی وصولی کے لیے مقدمہ پاکستان کے فیملی کورٹ میں دائر کر سکتی ہے۔

اپنے فیصلے کی تائید میں عدالت مندرجہ ذیل نکات پر غور کرتی ہے:

1. ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۶۳ کا بنیادی مقصد شادی اور خاندانی معاملات سے جڑے تنازعات کا تیزی سے تصفیہ اور نمٹانا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ ایکٹ خاندانی تنازعات کے حل کے لیے خصوصی عدالتیں بھی تشکیل دیتا ہے۔
2. اس قانون کی دفعہ ۱۰ فیملی کورٹس کو صلح کی ناکامی پر شادی کو تحلیل کرنے کا اختیار دیتی ہے۔
3. اسلامی تعلیمات میاں بیوی پر ایک غیر خوشگوار زندگی گزارنے کا جبر نہیں ڈالتی۔
4. اسلام عورت کو خلق کا حق دیتا ہے جس کی بدولت ایک مسلمان عورت اپنے آپ کو نکاح کے بندھن سے آزاد کر سکتی ہے اگر اسے کسی وجہ سے یہ محسوس ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس پر عدالت نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۲۹ سے استدلال کیا ہے: " طلاق دو مرتبہ ہے، پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، اور تمہارے لیے اس میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں جو تم نے انہیں دیا ہے مگر یہ کہ دونوں ڈریں کہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت معاوضہ دے کر پیچھا چھڑا لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں سو ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا سو وہی ظالم ہیں۔ "

فیصلہ:

عدالت نے ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ، ۱۹۶۳ کی دفعہ ۱۰ اور سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۹ کی تشریح پر مبنی فیصلہ دیا کہ اس دفعہ کے تحت مصالحت کی ناکامی کی صورت میں عدالت کو فوری طور پر نکاح تحلیل کرنے کا حکم دینے اور شوہر کو بیوی کے حق مہر کی ادائیگی کا حکم دینے

کا اختیار حاصل ہے۔ عدالت نے استدلال کیا کہ چونکہ شوہر پاکستان کا مستقل رہائشی ہے اس لیے اس کیس میں پاکستان کی فیملی کورٹ کو سننے کا اختیار حاصل ہے اور عائلی عدالت نے جو فیصلہ خلع کے ذریعے نکاح کو فسخ کرنے کے بارے میں دیا ہے وہ بالکل درست ہے اور پاکستان میں فیملی کورٹس کو اس معاملے کی سماعت کا مکمل اختیار حاصل ہے۔

ہبہ یعنی گفٹ کے ذریعے خواتین کو وراثتی جائیداد سے محروم کرنے کے حوالے سے

سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁸⁵

منویلا ارباب⁸⁶



کیس کے حقائق:

صحت بی بی [ایپیل کنندہ] اور بہار خان دولت [مدعا علیہ نمبر ۱]، دولت خان [مرحوم] کے ترکہ جائیداد میں قانونی وراثت تھی۔ دولت خان کی وفات سال ۱۹۸۰ میں ہوئی۔ ان کی وراثت کچھ زرعی اراضی تھی۔ بہار خان نے اپنے والد کی تمام جائیداد کا کنٹرول خود سنبھال لیا کہ ہبہ کے ذریعے تمام جائیداد اس کو منتقل کر دی گئی تھی۔ جبکہ صحت بی بی پردہ نشین خاتون ہو کر اس بات سے لاعلم تھی۔ بہار خان نے پھر اسی ترکہ جائیداد کو ریسیپانڈنٹ نمبر ۲ محمد زکریا پر فروخت کر دیا۔

صحت بی بی نے اپنے بھائی بہار خان اور محمد زکریا کے خلاف دیوانی مقدمہ دائر کیا جس کو ٹرائل کورٹ نے خارج کر دیا اور بعدہ اپیلیٹ کورٹ نے بھی مذکورہ بالا فیصلہ بحال رکھا، تاہم جب صحت بی بی نے ہائی کورٹ میں اپیل جمع کیا تو ہائی کورٹ نے ماتحت عدالتوں کے فیصلے منسوخ

⁸⁵ یہ فیصلہ جسٹس مسرت ہلالی نے تحریر کیا اور اسے ۲۰۱۷ کی سول ایپیل نمبر ۲۶-کیو کے تحت عدالتی ریکارڈ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

⁸⁶ طالبہ شریعہ اینڈ لاء، اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور و ممبر ٹیم آئین و قانون۔

کر کے صحت بی بی کا اپیل منظور کیا۔ عدالت نے بہار خان کو حکم دیا کہ وہ ۳ مہینوں کے اندر اندر صحت بی بی کو ان کا حصہ ادا کرے جو شریعت کے مطابق ۱۳ لاکھ روپے بنتے ہیں۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا اپیل کنندہ اپنے والد کے ترکہ جائیداد میں سے ایک تہائی حصہ حاصل کرنے کی حقدارہ ہے یا اس کے بجائے فروخت شدہ اراضی کے زریعہ میں ایک تہائی حصہ کی شرعی حقدارہ ہے؟

وکلاء کے دلائل:

اپیلانٹ نے عدالت سے استدعا کی کہ اس کو جائیداد میں ایک تہائی حصہ حاصل کرنے کے احکامات کریں۔ مزید یہ کہ فروخت شدہ اراضی کی زریعہ میں سے ایک تہائی حصہ دینا خلاف شریعت و قانون ہے کیونکہ وہ کل جائیداد میں ایک تہائی حصے کی حقدارہ ہے۔

اس کے برعکس بہار خان کے وکیل کا موقف تھا کہ مورث فریقین دولت خان نے اپنی حین و حیات میں ہی اپنے بیٹے بہار خان کے نام ترکہ جائیداد ہبہ کیا تھا جس پر اسکی بہن کی طرف سے کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ ٹرائل کورٹ کا فیصلہ قانون کے عین مطابق تھا، تاہم ہائی کورٹ کا فیصلہ خلاف قانون ہو کر قابل منسوخی ہے۔

عدالت عظمیٰ کا فیصلہ:

عدالت اپنے فیصلے کا آغاز قانون کے عام قاعدہ سے کرتی ہے کہ والدین کی وفات کے بعد ورثاء فوراً ترکہ جائیداد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ اس لئے دولت خان کی جائیداد میں دونوں ورثاء کا اپنا اپنا شرعی حصہ تھا جو انکو ملنا تھا مگر بہار خان نے انتقال نمبر ۵۶ محرمہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ کے ذریعے کل ترکہ جائیداد اپنے نام منتقل کروایا۔ جب اس انتقال کا جائزہ لیا گیا تو اس میں لکھا گیا تھا کہ دولت خان کا صرف ایک ہی قانونی وارث ہے اور اس کے سوا کوئی اور وارث نہیں ہے۔ اس انتقال کے ذریعے صحت بی بی کو اس کے شرعی حصے سے محروم کیا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بہار خان کے پاس ہبہ کو ثابت کرنے کے لئے کوئی بھی گواہ موجود نہ ہے۔ قانون شہادت آردو کے آرٹیکل ۱۲۹ [جی] کے تحت گواہ نا ہونے کی صورت میں یہ انتقال غیر قانونی ہے، جلساسازی اور دھوکہ دہی سے حاصل کردہ ہے اور اس کا مقصد محض بہن کو وراثت سے محروم

کرنا ہے۔ اس وجہ سے بہار خان اپنے والد کی پوری جائیداد کا مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور بہن کا مقررہ حصہ ہے جو اس کو ادا کیا جائے گا۔ عدالت اپنے فیصلے میں اسلامی قانون کا حوالہ بھی دیتی ہے جس کے مطابق بیٹی کو اپنے مرحوم والد کی مکمل جائیداد میں سے ایک تہائی حصہ ملنا تھا مگر اس کو دھوکے سے اس کے حصہ سے محروم کیا گیا ہے۔ اس لیے عدالت ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۷ کے فیصلے کو رد کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انتقال نمبر ۵۶ اور اس کے تسلسل میں تصدیق شدہ دیگر انتقال کو عدالت منسوخ قرار دیتی ہے۔ عدالت ریونیو انصران کو یہ حکم دیتی ہے کہ دولت خان کی جائیداد کو دوبارہ اس کے قانونی ورثاء میں تقسیم کیا جائے اور جو اراضی بہار خان نے پہلے سے بھیج دی ہے، اس کا حصہ رسدی جائیداد کا حصہ بنا کر اس کو تقسیم کیا جائے۔

حق حضانت یعنی کسڈی آف مانر کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کے جج؛ جسٹس اطہر من اللہ صاحب کا

ایک انتہائی اہم فیصلہ⁸⁷

محمد ذوالقرنین⁸⁸



نوٹ: یہ فیصلہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ کیا محض دوسری شادی کی بنا پر والد یا والدہ کو حضانت سے محروم کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر عدالتیں "بچے کی بہتری" کا فیصلہ کرتے وقت انحصار کر سکتی ہے۔

کیس کے حقائق:

⁸⁷ یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے فاضل جج، جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے لکھا ہے جن کے ساتھ جسٹس امین الدین خان نے اتفاق کیا ہے جو کہ دیوانی درخواست نمبر ۳۸۰ آف ۲۰۲۲ کے طور پر پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔

⁸⁸ وکیل عدالت عالیہ پشاور و شریک بانی ٹیم آئین و قانون۔

شائستہ حبیب نامی مدعیہ کی شادی ۲۱ جون ۲۰۱۲ کو عارف حبیب نامی مدعا علیہ کے ساتھ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ۱۷ اپریل ۲۰۱۳ کو ابراہیم کی پیدائش ہوئی۔ ابراہیم کی پیدائش کے بعد مدعیہ اور مدعا علیہ میں اختلافات جنم لیتے ہیں لیکن مختصر اذو حین کے درمیان ان اختلافات کا نتیجہ ۲۲ نومبر ۲۰۱۶ کو طلاق کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہاں پر یاد رہے کہ فریقین کے درمیان اختلافات اس حد تک گھمبیر ہو چکے تھے کہ مدعا علیہ کی جانب سے ایک طرف جسٹس آف پیس کے ذریعے مدعیہ پر ۲ جنوری ۲۰۱۷ کو ایف آئی آر کے اندراج کے ذریعے فوجداری مقدمات کا آغاز بھی کیا جاتا ہے تو دوسری طرف عائلی عدالت میں ابراہیم کی حضانت یعنی کسٹڈی کے لئے ۲۸ جنوری ۲۰۱۷ کو درخواست بھی دی جاتی ہے۔ مدعا علیہ یعنی عارف حبیب کی جانب سے بچے کی حضانت کے لئے دائر کردہ درخواست پر بالآخر چار سال کے صبر آزمائے انتظار کے بعد ۳۰ جون ۲۰۲۱ کو مدعا علیہ کے حق میں فیصلہ سنایا جاتا ہے یعنی عدالت یہ فیصلہ دیتی ہے کہ ابراہیم کی بہتری اس میں ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ رہے جس کے خلاف شائستہ حبیب کی جانب سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج سے رجوع کیا ہے لیکن مختصر یہ کہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کی جانب سے ۲۰ جون ۲۰۲۲ کو شائستہ حبیب کی اپیل بھی خارج کر دی جاتی ہے یعنی اپیل میں بھی والد کے حق میں فیصلہ برقرار رہتا ہے جس کے خلاف مدعیہ آئین پاکستان کو استعمال میں لاتے ہوئے آرڈیکل ۱۹۹ کے تحت مندرجہ بالا دونوں فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ لاہور میں آئینی درخواست یعنی رٹ پٹیشن جمع کرتی ہے لیکن مدعیہ کی آئینی درخواست بھی ۲۱ ستمبر ۲۰۲۲ کو خارج کر دی جاتی ہے یعنی تینوں عدالتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ ابراہیم کی بہتری اس میں ہے کہ وہ اپنے والد یعنی عارف حبیب کے ساتھ رہے لیکن مندرجہ بالا زکریا کے تینوں فیصلوں کے خلاف شائستہ حبیب عدالت عظمیٰ سے رجوع کرتی ہے۔ یہاں پر یاد رہے کہ عدالت عظمیٰ میں مدعیہ یعنی شائستہ حبیب بذات خود یعنی بغیر کسی وکیل کے پیش ہوتی ہیں۔

کیس کا آغاز:

عدالت عظمیٰ نے اس کیس کا آغاز فریقین بالخصوص ابراہیم کو سننے کے بعد اس بات سے کیا ہے کہ محمد ابراہیم باوجود والدین کے درمیان جدائی جیسی گھمبیر صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے نہ صرف پر اعتماد تھا بلکہ عدالت کی جانب سے پوچھے جانے والے سوالات کے جوابات بھی نہایت بہترین طریقے سے دئے۔ یہاں پر یاد رہے کہ ابراہیم نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ مدعا علیہ اس کا والد ہے لیکن چونکہ بچپن میں ہی والد کا گھر چھوڑنے کی وجہ سے اب وہ اس کے لئے ایک اجنبی سے زیادہ نہیں تو اس لئے اس نے والدہ سے جدا ہونے سے واضح طور پر ہچکچاہٹ

کا مظاہرہ کیا۔ ابراہیم کو سننے کے بعد عدالت نے مدعا علیہ کے وکیل کو بھی سنا اور اس کے بعد اس اہم فیصلے کا آغاز کیا۔

عدالت نے فریقین کو سننے کے بعد اپنے فیصلے کا آغاز ان امور کی نفاذ ہی سے کیا ہے کہ جس کی بنیاد پر تینوں عدالتوں یعنی ٹرائل کورٹ، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج اور عدالت عالیہ نے والد کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور مختصر لکھا ہے کہ تینوں عدالتوں نے صرف مدعیہ کی دوسری شادی اور بچے کی عمر کی وجہ سے والد کے حق فیصلہ دیا ہے اور ان عوامل کو سرے سے اہم ہی نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر اصل میں بچے کی بہتری کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یہاں پر عدالت نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ فریقین کے درمیان ٹرائل کے وقت ریکارڈ ہونے والی شہادت اس کیس کے صحیح فیصلے کے لئے کافی ہے لیکن شہادت کو بچے کی بہتری کی نظر سے جانچنا ہی نہیں گیا اور اس لئے عدالت نے اس موقع پر قرار دیا کہ بچے کی حضانت کا کوئی بھی فیصلہ جس میں بچے کی بہتری والے عوامل پر غور کئے بغیر فیصلے سنائے گئے ہوں تو وہ برقرار رہ نہیں سکتے اور نہ ہی وہ قانونی کہلا سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا امور کے زکر کے بعد عدالت نے حق حضانت پر ایک نہایت ہی جامع بحث باندھا ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ:

یہ ایک طے شدہ اور مسلم قانون ہے کہ والد ایک فطری سرپرست یعنی نیچرل گارڈین ہے جبکہ والدہ کو فطری طور پر مذکر بچے کی حضانت کا حق سات سال کی عمر تک جبکہ مؤنث اولاد کی حضانت کا حق بلوغت تک حاصل ہوتا ہے۔ والد، نیچرل گارڈین ہونے کے ناطے اولاد کی کفالت یعنی نان نفقے کا ذمہ دار ہے چاہے اولاد والدہ کے پاس کیوں نہ ہوں لیکن مندرجہ بالا زکر شدہ دونوں اصول حتمی نہیں ہیں بلکہ ان دونوں اصولوں کے ساتھ کچھ استثنائی صورتیں بھی پوسٹ ہیں جن کی تفصیل ملک خضر حیات خان بنام زینب بیگم میں موجود ہے۔ حق حضانت کا مکمل انحصار صرف اور صرف بچے کی بہتری کے اصول میں مضمر ہے اور بچے کی بہتری کا معیار ہر کیس میں الگ الگ ہوتا ہے لیکن بنیادی معیار جو کہ ہر کیس میں یکساں طور پر دیکھا جائے تو وہ بچے کی نہ صرف جسمانی، دماغی، نفسیاتی نقصان سے بچاؤ کی حفاظت ہے۔ یہاں پر عدالت نے بچے کی بہتری کے معیار کے طریقہ کار پر ہاؤس آف لارڈز کے ایک فیصلے پر بھی انحصار کیا ہے۔ یہاں پر عدالت نے گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ کے دفعہ ۱۷ [۳] کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اگر بچہ اتنا زمین ہو کہ وہ خود اپنے لئے ترجیح کر سکے تو اس کے ترجیح کو بھی قابل غور لایا جائے گا۔ یہاں پر عدالت نے واضح طور پر ایک اور نکتہ یہ لکھا ہے کہ اگر بچے کی بہتری والدین کے علاوہ کسی اور رشتہ دار مثلاً دادا، نانا، چھوٹی یا خالہ وغیرہ کو دینے میں ہو تو عدالت ان کو بھی بچے کی حضانت دے سکتی ہے۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت نے قرار دیا ہے کہ ابراہیم نہ صرف زہین، پر اعتماد اور اتنا سمجھ دار ہے کہ اپنے لئے ترجیح کر سکے اور چونکہ ابراہیم کا یہ کہنا ہے کہ اس کا والد اس کے لئے ایک اجنبی سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ اس نے والد کے ساتھ وقت ہی نہیں گزارا اور چونکہ وہ نہ صرف اپنی والدہ کے ساتھ نہ صرف آرام دہ ہے بلکہ اپنے غیر حقیقی باپ کے ساتھ بھی اس کے تعلقات خوش گوار ہیں اور چونکہ وہ پیدائش سے ہی اپنی والدہ کے ساتھ ہے اور چونکہ اس کے حقیقی باپ یعنی عارف حبیب نے بچے کے ساتھ ملاقات کے لئے کوئی خاص کوشش ہی نہیں کی اور چونکہ ابراہیم اپنے والد کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تو چونکہ مندرجہ بالا ذکر شدہ وہ بنیادی عوامل ہیں جن کو ابراہیم کی حضانت کا فیصلہ کرتے ہوئے عدالت نے غلطی سے متنبہ نہیں کیا تھا لیکن کسی بھی عدالت نے مندرجہ بالا عوامل کو درخور اعتنا یعنی قابل توجہ ہی نہیں سمجھا اور اس کی بجائے غیر ضروری عوامل پر توجہ دی تو جس لئے عدالت نے شائستہ حبیب کی اپیل کو منظور کرتے ہوئے تینوں عدالتوں کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے کر ابراہیم کی حضانت کا حق دار اس کی والدہ کو قرار دیا۔

مندرجہ بالا فیصلہ لکھنے کے بعد عدالت نے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۷، ۲۹ [۳] اور ۳۵ کے تحت ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی کہ بچوں کی بہتری کے لئے لازمی ہے کہ نہ صرف ایسے ججز تعینات ہوں جو کہ باقاعدہ ٹریننگ رکھتے ہوں اور عدالتوں کو تمام تر سہولیات بشمول ماہر نفسیات وغیرہ بھی دستیاب ہوں اور عدالتیں ایسی ہوں کہ جو بچوں کے حق میں بہتر ہوں۔ اس کے بعد عدالت نے مندرجہ بالا فیصلہ نہ صرف صدر پاکستان اور تمام گورنروں، چیف سیکرٹریز اور جوڈیشل اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرلز کو بھیجے گا حکم بھی صادر فرمایا۔

خلاصہ:

اس انتہائی اہم کیس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ بچے کی حضانت کا فیصلہ کرتے ہوئے بچے کی بہتری کو دیکھتے ہوئے تمام عوامل پر غور کیا جائے گا اور والد یا والدہ کو صرف بچے کی عمر یا دوسری شادی کی وجہ سے بچے کی حضانت یعنی کسٹڈی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

شادی کے لئے کم سے کم عمر کے تعین میں جنس کی بنیاد پر تفریق کے حوالے سے

عدالت عالیہ لاہور کا ایک اہم فیصلہ⁸⁹

عاقب فاروق⁹⁰



کیس کے حقائق:

مدعی نے سال ۲۰۲۳ میں پٹیشن دائر کی کہ ۲۰۱۰ میں صوبہ پنجاب کی حد تک ہونے والی ترمیم کے بعد Child Marriage Restraint Act, 1929 کی شق نمبر ۲-۱ے جنسی تفریق پر بنیاد رکھتی ہے اور اس شق کو غیر آئینی قرار دینے کی استدعا کی۔ اس استدعا کی بنیاد یہ تھی کہ متذکرہ بالا شق بچے کی تعریف کو بیان کرتے ہوئے کم از کم عمر مقرر کرتی ہے اور عمر کا یہ تعین جنسی تفریق پر بنیاد رکھتا ہے کیوں کہ اس میں شادی کے لیے بچی کی کم از کم عمر ۱۶ سال اور بچے کی کم از کم عمر ۱۸ سال ہے۔ اس سے جنسی بنیاد پر تفریق پیدا ہوتی ہے، لہذا اس شق کو غیر آئینی قرار دیا جائے۔

بنیادی سوال:

اس پٹیشن میں عدالت کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا شادی کی کم از کم عمر کا تعین کرتے ہوئے بچے کی تعریف میں جنسی تفریق کرنا آئین سے متصادم ہے؟

عدالتی کارروائی اور استدلال:

⁸⁹ یہ پٹیشن لاہور ہائی کورٹ لاہور کے سٹگنل بچ نے سنی اور اس پٹیشن کا فیصلہ جسٹس شاہد کریم نے تحریر کیا ہے اور اسے "اذکی و حید بنام صوبہ پنجاب وغیرہ" یا آئینی درخواست نمبر ۹۸۷۳۲۷۸۳۲ آف ۲۰۲۳ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁹⁰ ممبر ٹیم آئین و قانون۔

اس پیشین میں مدعی کے وکلاء نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ مندرکہ بالا شق آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۵ سے متضاد ہے، لہذا اس کو غیر آئینی قرار دیا جائے۔ حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل صاحب نے ایک شاندار بریف پیش کیا، جس میں یہ واضح کیا گیا کہ اسلامی فقہ و قانون اور جدید سائنس میں یہ حقیقت مسلم ہے کہ بچیاں بچوں کی نسبت جلدی بلوغت حاصل کر لیتی ہیں، لہذا مندرکہ بالا شق غیر آئینی نہ ہے بلکہ وہ اسلامی فقہ و قانون اور جدید سائنس پر بنیاد رکھتی ہے۔ ان تمام دلائل کو پرکھنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ لاہور کے فاضل جج جسٹس شاہد کریم نے فیصلہ لکھتے وقت بیان کیا کہ اس ایکٹ کا مقصد شادی کے لیے کم از کم عمر مختص کرنا ہے تاکہ بلوغت کی بنیاد پر شادی کا معاملہ چھوڑنا کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اس قانون میں بلوغت، جو کہ مختلف انسان مختلف عمر میں حاصل کرتے ہیں، کو نظر انداز کر کے شادی کے لیے کم از کم عمر کا تعین نہ ہوتا۔ جسٹس شاہد کریم نے واضح کیا کہ اس پیشین میں بھی یہ ہی سوال زیر بحث ہے کہ شادی کے لیے کم از کم عمر مختص کرتے وقت جنسی تفریق کرنا آئینی طور پر درست ہے یا نہیں تاکہ بلوغت کا سوال زیر بحث ہے۔ بعد ازاں جسٹس شاہد کریم نے آئین پاکستان میں موجود "حکمت عملی کے اصول" کے باب سے آرٹیکل ۳۵ کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس کے مطابق ریاست کی ذمہ داری ہے شادی، خاندان، ماں اور بچے کی حفاظت کرے۔ معزز جج صاحب اس سے استدلال کرتے ہیں کہ جب شادی اور خاندان کی حفاظت کے لیے ماں کی حفاظت ضروری ہے تو ریاست قانون سازی کرتے وقت ماں یعنی عورت کی کم از کم عمر نے تعین میں تفریق کس طرح پیدا کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے آئین کے آرٹیکل ۲۵ کا حوالہ دیا کہ جنسی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی جائے گی اور یہ شق عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے ریاست کو خاص قوانین بنانے کا اختیار بھی دیتی ہے اور اس کی بنیاد امریکہ کے آئینی قانون کا تصور "ایجابی عمل سرکار"⁹¹ ہے۔

عدالتی فیصلہ:

⁹¹ Affirmative Action

تمام تر استدلال کے بعد معزز جج جسٹس شاہد کریم نے فیصلہ دیا کہ مندرکہ بالا شق جنسی تفریق پر بنیاد رکھتی ہے، لہذا اسے غیر آئینی قرار دیا جاتا ہے اور حکومت پنجاب کو ہدایت جاری کی جاتی ہے کہ اس فیصلہ کی روشنی میں مذکورہ ایکٹ کا نظر ثانی شدہ / ترمیم شدہ نسخہ جاری کرے اور ۱۵ دن کے اندر اندر اپنی ویب سائٹ پر اپلوڈ کرے۔

لاہور ہائی کورٹ کا عبوری کسٹومی [حضانہ] کے حوالے سے ایپیلیٹ کورٹ کے دائرہ

اختیار پر اہم فیصلہ⁹²

عروج شہباز⁹³



کیس کے حقائق:

درخواست گزار [عائشہ طاہر] یعنی بچے محمد بابر کی ماں ایپیلیٹ کورٹ کے ۱۱ جون ۲۰۲۲ کو دیے گئے آرڈر کے خلاف اپیل دائر کرتی ہے اس آرڈر میں عدالت ۳۱ مئی ۲۰۲۲ کو ٹرائل کورٹ کے دیے گئے فیصلے کے برعکس بچے کی عبوری کسٹومی [حضانہ] مدعی علیہ [باپ] کو دے دیتی ہے جبکہ ٹرائل کورٹ کے ۳۱ مئی کو دیے گئے فیصلے کے مطابق بچے کی کسٹومی [حضانہ] ماں کو دی گئی تھی جس کی عمر تقریباً ۳ سال اور ۶ ماہ ہے عدالت نے یہ فیصلہ گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ کے دفعہ ۱۲ کے تحت دیا تھا۔

عدالت کے سامنے بنیادی سوال:

⁹² یہ فیصلہ جسٹس انوار حسین نے تحریر کیا اور اس کیس کا حوالہ "سال ۲۰۲۲ کی رٹ پٹیشن نمبر ۳۶۹۱۰ ہے۔"

⁹³ طالب علم، ایل ایل بی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد و ممبر آئین و قانون۔

لاہور ہائی کورٹ کے سامنے اہم سوال یہ تھا کہ کیا ایپیلیٹ کورٹ کے پاس گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ، ۱۸۹۰ کے دفعہ ۱۲ کے تحت عبوری کسٹڈی [حضانت] کے حکم کے خلاف ایپیل سننے کا دائرہ اختیار ہے؟

درخواست گزار نے عدالت سے استدعا کی کہ مدعی علیہ کی ایپیل قابل سماعت نہیں تھی کیونکہ حکم عبوری نوعیت کا تھا انہوں نے مزید کہا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایپیل قانون کے تحت قابل سماعت تھی، تب بھی ایپیلیٹ کورٹ کا حکم غیر قانونیت کا شکار ہے کیونکہ بچے کی عمر کم ہے اور اس کا ماں کی مسلسل نگہداشت میں رہنا ضروری ہے تاہم بچے کو اس طرح کی دیکھ بھال سے محروم کر دیا گیا ہے اور اس کی عبوری کسٹڈی باپ [مدعی علیہ] کو دے دی گئی ہے جو کہ ایک بینکر ہے اور اپنی ملازمت کی نوعیت کی وجہ سے بچے کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر ہے جبکہ درخواست گزار کی طلاق ہو چکی ہے اور بچے کی فلاح و بہبود کے لیے ماں نے دوبارہ شادی نہیں کی اور نہ ہی ماں کوئی ملازمت کرتی ہے۔ اس لیے ماں کے پاس بچے کی کسٹڈی بچے کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین ہے۔

اس کے برعکس مدعی علیہ کے وکیل نے اعتراف کیا کہ ایکٹ کے دفعہ ۱۷ کے مطابق مدعا علیہ کی ایپیل قابل سماعت نہیں تھی، تاہم ماں نے خود اس بچے کو چھوڑ دیا اور حالات کے مطابق بچے کی بہبود باپ کے ساتھ ہے، جس پر غور کیا جانا چاہیے۔ مزید مدعی علیہ نے قانونی نظیروں کا حوالہ دیتے ہوئے نابالغ بچے کی بہبود کے لیے کسٹڈی کے استحکام پر زور دیا جس میں کسٹڈی کی بار بار تبدیلی کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔

عدالت کا فیصلہ:

عدالت نے اپنے فیصلے کا آغاز ایپیلیٹ کورٹ کے دائرہ اختیار سے کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایپیلیٹ کورٹ کے پاس ایپیل پر غور کرنے کا دائرہ اختیار ہے۔ اس نے اپنے فیصلے کی بنیاد ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ، ۱۹۶۳ کے دفعہ ۱۳ پر رکھی جس میں فیملی کورٹس کے فیصلوں کے خلاف ایپیل کی اجازت دی گئی اور اس میں سرپرستی کے معاملات بھی شامل ہیں۔ اس لیے مذکورہ ایپیل قابل سماعت تھی۔

عدالت عالیہ نے گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ، ۱۸۹۰ء کے دفعہ ۴ کا حوالہ دیا، جس میں دفعہ ۱۲ کے تحت ایبل کے احکامات کے متعلق کچھ خاص ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم عدالت نے نوٹ کیا کہ ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ، ۱۹۶۳ء ان معاملات کو فیملی کورٹس کے دائرہ اختیار میں لاتا ہے، اور عبوری کسٹڈی کے متعلق احکامات کے اجازت دیتا ہے۔

مندرجہ بالا اصول کے تعین کے بعد عدالت نے اس بات پر زور دیا کہ عبوری کسٹڈی کے معاملات میں بچے کی فلاح اہم ہونی چاہیے۔ عدالت نے مزید کہا کہ ماں کی طرف سے کسٹڈی کے حقوق سے دستبردار ہونے کا کوئی بھی معاہدہ کالعدم ہے کیونکہ یہ عوامی پالیسی کے خلاف ہے۔

عدالت نے نشاندہی کی کہ سرپرست کی درخواست دائر ہونے سے چند ماہ قبل تک نابالغ بچہ ماں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عدالت نے اس بات پر زور دیا کہ بچے کی فلاح و بہبود کو والدین کے درمیان انا پرستانہ لڑائیوں پر غالب آنا چاہیے۔ عدالت عالیہ نے آئینی درخواست کی اجازت دے دی اور غیر منقولہ فیصلے کو ایک طرف رکھتے ہوئے ماں کے پاس بچے کی عبوری کسٹڈی کا حکم بحال کر دیا۔ عدالت عالیہ نے گارڈین کورٹ کو ۳ ماہ کے اندر زیر التواء سرپرست کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے کی ہدایت دی۔